انسان اور اس کے مسائل

مولانا سید جلال الدین عمری

Rs. 40.00

PN-755

انسان
اور
اس کے مسائل

مولانا سید جلال الدین عمری

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۷۵۵

نام کتاب : انسان اور اس کے مسائل
مصنف : مولانا سید جلال الدین عمری
صفحات : ۹۶
اشاعت : جنوری ۲۰۱۱ء
تعداد : ۱۱۰۰
قیمت : ۴۰/- روپے
ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز
ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
فون: ۲۶۹۷۱۶۵۲، ۲۶۹۵۴۳۳۱ فیکس: ۲۶۹۴۷۸۵۸
E-mail: mmipublishers@gmail.com
Website: www.mmipublishers.net
مطبوعہ : ایچ۔ ایس۔ آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی-۲

INSAAN AUR USKE MASAEL (Urdu)
By: Maulana Sayyid Jalaluddin Umri
Pages: 96
Price: Rs. 40.00

فہرست مضامین

❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

انسان کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ فلسفہ کا ہے، جو حقیقت سے بہ راہِ راست بحث کرتا ہے۔ انسان کی تخلیق، اس کی غرض و غایت اور اس وسیع کائنات سے اس کے ربط و تعلق کے بارے میں فلسفہ کا اندازِ گفتگو خالص علمی ہوتا ہے۔ بحث کا یہ طریقہ دشوار بھی ہے اور یہ مفید بھی ان ہی لوگوں کے لیے ہوتا ہے جن کا معیارِ علم و تحقیق بلند ہو، لیکن جن لوگوں کی علمی سطح زیادہ اونچی نہ ہو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے لیے بحث ونظر کا دوسرا طریقہ زیادہ کارآمد ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی حقیقت سے اس کے مسائل کی روشنی میں ــــ بحث کی جائے۔ عام ذہن بہ راہِ راست حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتا۔ وہ حقیقت کو روز مرّہ کے مسائل و حالات میں رکھ کر دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے انسان جن مسائل سے دو چار ہوتا ہے وہی اس کے حقیقی مسائل ہیں۔ ان مسائل سے گفتگو نظری گفتگو سے زیادہ دل چسپ بھی ہوتی ہے اور زیادہ سود مند بھی۔ کیوں کہ اس میں ان سوالات کا جواب ہوتا ہے جو صبح و شام انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کے حل کے لیے انسان کی فطرت بے تاب رہتی ہے۔

اس کتاب میں بحث ونظر کا یہی دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ پہلے مسائل کی اصولی تقسیم ہے اور پھر اس تقسیم کے تحت اسلامی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک اسلام انسان کے چھوٹے بڑے تمام مسائل کا صحیح اور کام یاب حل ہے۔ وہ اپنے اندر ایسی ابدی صداقتیں رکھتا ہے کہ ہر دور اور ہر مقام کے مسائل کو حل کرسکتا ہے۔ زندگی کا ایسا کوئی سوال نہیں ہے جس کا جواب اسلام نہ دیتا ہو۔ انسان نے اپنے مسائل کے حل کے لیے اب تک جتنے فلسفے ایجاد کیے وہ یا تو بری طرح ناکام ہو چکے ہیں، یا ناکامی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کی راہ نمائی سے انسان جب تک نہیں نکلتا اپنے آپ کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔

کتاب میں علمی مباحث اور فنی اصطلاحات سے حتی الوسع گریز کیا گیا ہے۔ زبان بھی انتہائی سادہ اور آسان استعمال کی گئی ہے۔ آخر میں ان اسباب کا مختصر سا جائزہ ہے جو اسلام کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ جو خدا کے بندے ان اوراق میں اپنے مسائل کا اسلامی حل تلاش کریں گے، ان شاء اللہ ان کو مایوسی نہیں ہوگی اور یہی ان کی تحریر کا مقصد ہے۔

جلال الدین

۲۴ر اگست ۱۹۶۰ء

نظرِ ثانی

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۰ء میں چھپی۔ اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پاکستان سے بھی یہ شائع ہوتی رہی ہے۔ اس کے پڑھنے والوں نے اسے ہمیشہ پسند کیا اور اسلام کے ابتدائی تعارف کے لیے مفید قرار دیا۔ اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طویل عرصہ کے بعد اب اس کا موقع عنایت فرمایا ہے۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈال کر اسے مزید بہتر اور مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ کوئی بڑی ترمیم یا اضافہ اس لیے نہیں کیا ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل کتاب پیشِ نظر ہے، جس کا بڑا حصہ مضامین کی شکل میں چھپ بھی چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

جلال الدین

۲۹ر دسمبر ۱۹۹۱ء

طبع نہم

'انسان اور اس کے مسائل' کا یہ نواں ایڈیشن ہے۔ اب کی بار یہ کتاب صوری اور معنوی لحاظ سے مزید بہتر شکل میں پیش ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں عبارت میں لفظی اصلاح و ترمیم کی گئی ہے۔ دو ایک مقامات پر مضمون کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش بھی ہوئی ہے۔ کتاب کی نئی کمپوزنگ ہوئی ہے۔ پروف ریڈنگ پر خاص توجہ کی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود غلطیوں کا امکان ہے۔ کتاب کا انگریزی، ہندی، تلگو اور مرہٹی وغیرہ میں ترجمہ بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے اور اس کے بندوں کو ان سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔

جلال الدین

۱۳ر جنوری ۲۰۱۱ء

مسائل کیا ہیں؟

زندگی کے بہت سے مسائل ہیں۔ پیٹ کا مسئلہ، کپڑے کا مسئلہ، تعلیم کا مسئلہ، مکان و رہائش کا مسئلہ، معاشرت اور تہذیب کا مسئلہ، جنگ اور صلح کا مسئلہ، جان و مال اور عزت اور آبرو کے تحفظ کا مسئلہ، غرض ایک دو نہیں بے شمار مسائل نے انسان کو گھیر رکھا ہے۔ ان مسائل کا تعلق خواہ کسی ایک فرد سے ہو یا خاندان، سوسائٹی اور ریاست سے، ہم ان سب کو تین عنوانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ نظریات، سماجی تعلقات اور قانون ــــ زندگی کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے ان عنوانات کے تحت نہ آتا ہو۔

انسان کے جتنے مسائل ہیں وہ سب اس اصل سے نکلتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں کیا سوچتا اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اس وسیع دنیا کے متعلق کیا نظریہ قائم کرتا ہے؟ اس سے اس کائنات میں اس کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے اور یہ تعین بتاتا ہے کہ اس کی سماجی و معاشرتی مصروفیات کا رُخ کیا ہونا چاہیے؟ لیکن عمل کی دنیا میں اس کے سامنے سب سے پہلے دو سوالات آتے ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی کے مختلف مسائل میں وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ کن بنیادوں پر معاملہ کرتا ہے دوسرے یہ کہ وہ کس قانون کی اتباع کرتا ہے۔ یعنی وہ کون سی اتھارٹی ہے جس کی وہ مخالفت نہیں کرسکتا اور جس کا فیصلہ اس کے لیے آخری فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے؟

نظریات

انسان پیدا ہوتے ہی اپنے آپ کو ایسے ماحول میں پاتا ہے جہاں سورج اور چاند کا طلوع و غروب ہے، دن آتا اور رات جاتی ہے، آسمان پر تارے جھلملاتے اور

ڈوب جاتے ہیں، زمین لہلہاتی اور مرجھا جاتی ہے، چشمے رواں ہوتے اور خشک ہوتے ہیں، درختوں اور کھیتوں میں بہار آتی اور چلی جاتی ہے۔ یہ انقلابات یوں ہی نہیں گزر جاتے بل کہ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دن نکلتا ہے تو وہ اپنی جدو جہد کا آغاز کرتا ہے، رات اس کی آسائش کا ذریعہ ہے، زمین کی روئیدگی سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے اور خشک سالی اس کو نقصان پہنچاتی ہے، ہوا اور پانی اس کو زندگی بخشتے ہیں، لیکن یہی ہوا اور پانی سیلاب اور آندھی بن کر اس سے زندگی چھین بھی لیتے ہیں۔ زمین کا سینہ اس کی سکونت کی جگہ ہے، لیکن یہی زمین کبھی اس کو اپنے اوپر برداشت کرنے سے انکار بھی کردیتی ہے۔ اس طرح انسان کے چاروں طرف ہونے والے انقلابات اس کے لیے پیامِ مسرّت بھی ہیں اور غم کا سبب بھی۔ اس کو راحت بھی پہنچاتے ہیں اور تکلیف بھی، ان سے وہ صحت بھی پاتا ہے اور مرض سے بھی دو چار ہوتا رہتا ہے، اس لیے وہ ان انقلابات کا ایک تماشائی کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کرسکتا، بل کہ وہ ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہے کہ ان کے پیچھے کیا اسباب ہیں اور یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

کبھی اس کو خیال ہوا کہ نہ زمین پر اس کا حکم چلتا ہے نہ آسمان پر، اس کی مرضی کا پابند نہ سورج ہے نہ چاند، اس کے فرمان کے تابع نہ پانی ہے نہ ہوا۔ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو اس کائنات کی بے شمار قوتوں کے مقابلے میں انتہائی کم زور اور بے بس ہے، وہ ان پر کوئی زور اور اقتدار نہیں رکھتا، وہ چاہیں تو اسے زندہ رکھیں اور چاہیں تو ختم کردیں، چاہیں صحت و تندرستی دیں، چاہیں چھین لیں۔ جیسے ہی یہ احساس اس کے اندر پیدا ہوا دنیا کی ہر وہ چیز اس کو ڈرانے لگی جو کسی بھی حیثیت سے اس کو نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ زمین کی اس نے پرستش کی، کیوں کہ وہ بہت سے خزانوں کی مالک ہے۔ آسمان کو دیوتا بنا لیا، کیوں کہ اس سے نعمتیں برستی ہیں۔ پہاڑوں کے سامنے اس کا سر جھک گیا، اس لیے کہ وہ اس سے اونچے ہیں۔ سمندروں سے وہ لرزہ براندام تھا، کیوں کہ اس کی سرکش موجیں اس کو ہلاک کرسکتی ہیں۔ اس طرح ہر چھوٹی بڑی طاقت نے اس پر حکم رانی کی اور اس نے اس کی اطاعت قبول کرلی۔

بعض اوقات اس نے سوچا کہ جن چیزوں سے وہ سہما ہوا ہے اور جو اس کو عظیم اقتدار کی مالک نظر آتی ہیں وہ بھی بے بس و مجبور ہیں۔ آفتاب ہر وقت اس کو روشنی کیوں نہیں پہنچاتا؟ دمکتے چاند کو گہن کیوں لگ جاتا ہے؟ تارے ڈوب کیوں جاتے ہیں؟ زمین اپنی مرضی سے غلّہ کیوں نہیں اگاتی؟ پہاڑ کیوں خاص قوانین کے پابند ہیں؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کائنات میں بعض نامعلوم قوتیں کام کر رہی ہیں، جن کے حکم سے آگ روشن ہے، پانی جن کے اشارے سے برستا ہے اور زمین جن کی اجازت سے غلّہ اگاتی ہے۔ قحط اور شادابی، خوش حالی و بدحالی، تن درستی و بیماری، غریبی و مال داری، موت و حیات، غرض ہر طرح کا تصرف وہ یہاں کر رہی ہیں؟

اب انسان کو یہ فکر دامن گیر ہوگئی کہ وہ ان قوتوں کو جانے اور سمجھے جنھیں وہ دیکھ تو نہیں رہا ہے، لیکن جن کے مظاہر کا وہ ہر طرف مشاہدہ کر رہا ہے۔

لیکن ان دیکھی قوتوں کا یہ تصوّر، انسان کے فطری تجسّس کو ختم نہ کرسکا۔ اس نے سوچا جن قوتوں کو میں دیکھ نہیں رہا ہوں انھیں کیوں تسلیم کروں؟ جب مجھے نہیں معلوم کہ اس کائنات میں کس کی حکم رانی ہے تو اس کا اقرار کیسا؟ چناں چہ اس نے کہا اس کائنات میں بعض مخصوص اسباب کے ایک جا ہوجانے سے بعض خاص قسم کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ آگ جلاتی ہے، بارش سے پودوں کو روئیدگی اور نشو و نما حاصل ہوتی ہے، سنکھیا سے آدمی مرتا اور امرت سے صحت پاتا ہے، یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن ہم نہیں جانتے کیوں ایسا ہوتا ہے؟ ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہ یہ کہ ہم ایک ایسے ماحول میں موجود ہیں، جہاں ہمارے موافق و مخالف قوتیں پوری شدت سے ہر طرف کام کر رہی ہیں، اس لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان موافق قوتوں سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے اور مخالف قوتوں سے کیسے بچا جائے؟ نہ یہ کہ یہ دنیا کیا ہے؟ اس کو کس نے پیدا کیا؟ کون چلا رہا ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ ہم پر کس کی حکم رانی ہے؟ اس طرح کا ہر سوال فضول ہے۔

انسان کو وجود میں آئے ایک اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ سال گزر گئے۔ اس

دوران میں اس نے بے شمار تجربات کیے، تہذیب وتمدن میں ترقی کی، نت نئی چیزیں دریافت کیں، علوم وفنون دریافت کیے، جس کے نتیجہ میں غور وفکر کا نیا مواد اس کے سامنے آتا رہا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی تلاش وجستجو کا آغاز جہاں سے کیا تھا آج بھی وہیں ہے۔ اس کے ذہن نے پہلے روز جس حیرانی وگم گشتگی کے عالم میں یہ سوال چھیڑا تھا کہ یہ دنیا کیا ہے اور میں کیا ہوں؟ آج بھی اسی حیرانی کے عالم میں وہ اعلان کر رہا ہے کہ یہ دنیا کیا ہے اور میں کیا ہوں؟ اور جب تک وہ حقیقت سے آشنا نہ ہوجائے یہ سوال اس کے لیے معمہ ہی رہے گا۔

سماجی تعلقات

انسان طبعًا انفرادیت سے گھبراتا ہے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور بھی ہے۔ وہ دوسروں کے تعاون کے بغیر اپنے کھانے، کپڑے اور رہنے سہنے کے مسائل تک حل نہیں کرسکتا، اس لیے وہ ہمیشہ اپنے ہم جنسوں سے تعلق کی نوعیت پر غور کرتا رہا ہے۔ ایک فرد سے دوسرے فرد کا کیا رشتہ ہے؟ فرد اور ریاست کو جوڑنے والے اصول کیا ہیں؟ عورت اور مرد کے روابط کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ ہم سایہ اور اجنبی، اہلِ وطن اور غیر اہلِ وطن کے ساتھ کن بنیادوں پر سلوک ہو؟ اس طرح کے جتنے سوالات ابھرتے ہیں ان کے مختلف اور بسا اوقات متضاد جوابات اس نے دیے ہیں، لیکن بعض باتوں پر اس کا اتفاق بھی رہا ہے۔ یہ اتفاق کسی خارجی تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں نہیں، بل کہ فطرت کے دباؤ اور اس کے تقاضوں کے تحت ہوا ہے۔ اس کی فطرت نے اسے بتایا کہ عدل وانصاف، راستی، امانت ودیانت، وعدہ وفائی، عفو ودرگزر، صلۂ رحمی، محبت وہم دردی، عفت وعصمت جیسی صفات کے ذریعہ ہر تعلق خوش گوار ہوسکتا ہے، اس لیے ان صفات کو سماجی تعلقات کی اساس ہونا چاہیے۔ اب تک کا تجربہ بھی یہی رہا ہے کہ جہاں کہیں جس مقدار میں یہ صفات پائی گئیں اسی تناسب سے انسانی تعلقات بہتر اور خوش گوار ہوے۔ تعلقات کے ان فطری اصول کو اصولِ اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ جب کبھی ان کی مخالفت ہوئی تعلقات میں بگاڑ

اور فساد رونما ہوا۔ ظلم وزیادتی، مکروفریب، خیانت، بے وفائی، حق تلفی، غصب اور انتقام نے انسان کو درندہ صفت بنادیا، بل کہ دوسروں سے اس کے تعلقات حیوانیت کی سطح سے بھی نیچے آگئے۔

لیکن اس سب کے باوجود سوال اصول اخلاق کی پابندی کا ہے۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص کے مفادات اور دل چسپیوں کا مرکز دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی ذات سے جو دل چسپی ہوتی ہے وہ دوسرے سے نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اہل وعیال اور خاندان والوں سے جتنی محبت کرتا ہے اتنی محبت ان افراد سے نہیں کرتا جو اس کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس کو اپنی قوم اور وطن سے جو لگاؤ ہوتا ہے کسی دوسری قوم سے وہ لگاؤ نہیں ہوتا۔ اگر انسان اپنے تعلقات میں اصولِ اخلاق کا پابند ہو تو بسا اوقات اس کے ان مفادات پر ضرب لگتی ہے۔ کبھی اس کا ذاتی نقصان ہوتا ہے، کبھی خاندانی تعلقات مجروح ہوتے ہیں، کبھی قوم اور وطن کے فائدوں پر آنچ آتی ہے۔ بعض اوقات یہ نقصانات اپنی آخری حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ انسان آسانی سے ان کو برداشت نہیں کرپاتا اور فوراً اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اخلاق کی قدر وقیمت اتنی زیادہ ہے کہ ہر حال میں اس کا احترام ضروری ہے؟ کیا سچائی پر اس وقت بھی قائم رہنا چاہیے، جب کہ تلوار سر پر لٹک رہی ہو؟ کیا دشمن کو فریب دینا بھی کوئی جرم ہے؟ کیا عفو ودرگزر ہر حال میں قابلِ تعریف ہے یا کبھی انتقام بھی پسندیدہ ہے؟ یہیں سے یہ بحث شروع ہوتی ہے کہ اخلاق کسے کہتے ہیں؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا اخلاقی قدریں دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں یا یہ حالات کے تابع ہیں اور ان میں تبدیلی آسکتی ہے؟

بعض مفکرین نے اس کے جواب میں صاف صاف کہہ دیا اور عمل تو بیش تر انسانوں کا اسی کی تائید میں ہے کہ اصولِ اخلاق کی پابندی ہر وقت ضروری نہیں ہے، بل کہ بعض اوقات ان کی مخالفت ناگزیر ہوجاتی ہے۔ کسی باپ کا بیٹے کو ہلاک کرنا اخلاقی جرم ہے، لیکن بیٹا اگر قوم کا غدار ہو تو باپ کا یہ اقدام، قوم کے ساتھ اس کی وفاداری

کی دلیل ہے۔ سچ کہنا اخلاقی خوبی ہے، لیکن دشمن کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا بے وقوفی ہے۔ تواضع و خاک ساری اچھی صفت ہے، لیکن یہی صفت ناپسندیدہ ہے اگر اس کے اظہار سے آدمی کی ذلت و رسوائی ہو اور اس کے وقار کو صدمہ پہنچے۔

لیکن اگر اس کلیہ کو تسلیم کرلیا جائے کہ ذاتی و قومی مفاد کے لیے اخلاقی اصولوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے تو کسی بھی شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان پر ثابت قدم رہے گا۔ کیوں کہ ہر شخص کو اپنا مفاد زیادہ عزیز اور قیمتی ہوتا ہے، خواہ دنیا اس کو کتنا ہی کم اہم اور بے قیمت ہی کیوں نہ سمجھے۔ اس لیے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ فلاں فائدے کو اخلاق سے بلند و برتر ہونا چاہیے اور فلاں کو فروتر۔

اس نظریے کے برعکس بعض حضرات نے کہا کہ اخلاق کو ہر نفع و ضرر سے بالا ہونا چاہیے۔ سچائی سے انحراف کبھی صحیح نہیں ہے، خواہ اس کے نتیجے میں، سر، تن سے جدا ہوجائے اور بڑے سے بڑا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ عدل و انصاف کا دامن نہیں چھوڑا جاسکتا، خواہ اس کی زد میں اپنی اولاد ہی کیوں نہ آئے۔ فریب دہی ہر حال میں ناجائز ہے، خواہ اس سے قوم و وطن کو کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ پہنچے۔

لیکن کیا انسان اخلاق کے لیے ہمیشہ اتنی بڑی قربانیاں دے سکے گا؟ کیا اقتدار و قوت کے ہوتے ہوئے وہ جبر و تشدّد سے باز رہے گا؟ کیا فقر و فاقے میں چوری اس سے متوقع نہیں؟ کیا خواہشِ نفس کے غلبہ کے باوجود وہ عفت و عصمت پر ثابت قدم رہ سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اخلاق کا احترام چوں کہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لیے اخلاق شکنی کو اس کے ضمیر نے ہمیشہ جرم ہی سمجھا ہے۔ اگر اس سے خلافِ اخلاق حرکات کا صدور ہوا ہے تو خارجی اثرات کے دباؤ سے ہوا ہے۔ یہ اثرات نہ ہوں تو وہ اخلاق کی خاطر ہر مشکل جھیل سکتا ہے، اس لیے ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انسان کا ضمیر بے دار ہو اور اس کی فطرت غبار آلود نہ ہونے پائے۔ پھر نہ تو کوئی کسی

کی عزت و آبرو لوٹے گا نہ کسی کی جان و مال پر قبضہ کرے گا اور نہ دھوکا، فریب، الزام تراشی جیسی بداخلاقیوں کا مرتکب ہوگا۔

قانون

اس میں شک نہیں کہ انسان طبعاً خیر پسند ہے، لیکن وہ اپنے ارادہ و عمل میں آزاد بھی ہے، اس لیے بڑے سے بڑا جرم بھی اس سے بعید نہیں۔ وہ دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہے، قوم کے ساتھ غداری کرسکتا ہے، ملک کے مصالح اور مفادات کے خلاف جدّ و جہد کرسکتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر غلط اور ناجائز اقدام اس کے لیے ممکن ہے۔ اسی لیے قانون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اخلاق کے ذریعہ تعلقات کو خوش گوار تو بنایا جاسکتا ہے، لیکن ان کو مجروح ہونے سے بچایا نہیں جاسکتا۔ یہ کام قانون کا ہے۔ قانون کے بغیر محض اخلاق کے سہارے کوئی اجتماعیت اسی وقت چل سکتی ہے جب کہ انسان فرشتہ بن جائے اور اس سے کسی غیر اخلاقی رویّہ کا امکان باقی نہ رہے۔ لیکن خود قانون کے سلسلہ میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحیح قوانین اور غلط قوانین کا علم کیسے ہو؟ اس کا تعین کون کرے کہ انسان کا فلاں عمل فرد اور جماعت کے حق میں ضرر رساں ہے اور فلاں نفع بخش؟ وہ حدود کیا ہیں جن میں تجارت، زراعت، تعلیم، تہذیب، سیاست اور تقریر و تحریر جیسے تمام امور کی آزادی ملنی چاہیے؟ اور کہاں یہ حدود ختم ہوتے ہیں؟

اس کے جواب میں آمریت نے کہا: قانون سازی اس شخص کا حق ہے جو قوم میں سب سے بڑا ہے اور جس کے ہاتھ میں قوت و اقتدار ہے وہی قوم کی بھلائی اور برائی کو سمجھ سکتا ہے، کسی دوسرے میں نہ تو یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ قوم کے نفع و نقصان کا فیصلہ کرے اور نہ اسے اس کا حق ہی حاصل ہے۔ آمر کا کام ہے حکم دینا اور مامور کا کام ہے اس کی اطاعت کرنا۔ یہ آمریت کا اصول ہے، اس سے کم پر وہ تیار نہیں ہوتی۔

آمریت پر اعتراض ہوا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ قوم کا سب سے بڑا جو بھی قانون بنائے گا وہ ہمیشہ قوم کے حق میں مفید ہی ہوگا؟ کیا وہ اپنی ذاتی اغراض کو

دوسروں کے فائدوں پر ترجیح نہیں دے سکتا؟ کیا اس سے اس بات کا امکان نہیں کہ قوم کے جذبات کو مجروح کرے اور عدل و انصاف کو چھوڑ کر ظلم کی راہ اختیار کرے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وہ صاحبِ اقتدار ہو اور اس سے باز پرس کرنے والی کوئی قوت موجود نہ ہو؟ یہ نرا خدشہ ہی نہیں، بل کہ آمریت کی پوری تاریخ اس کی تائید کرتی ہے۔ انسانوں نے اقتدار کے نشے میں بھیڑیوں اور درندوں سے بھی زیادہ سفا کی کا مظاہرہ کیا ہے۔

آمریت کے ان سنگین نتائج سے نجات پانے کے لیے یہ صورت نکالی گئی کہ قانون سازی کا حق پوری قوم کو دے دیا گیا کہ وہ اپنی قسمت کی آپ مالک ہو اور اس کے بھلے برے کا فیصلہ کسی ایک شخص کی خواہش پر منحصر نہ ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم اپنے حق کو کیسے کام میں لائے؟ ظاہر ہے نہ تو اس کا کوئی امکان ہے کہ قوم کے چھوٹے بڑے تمام افراد مل کر اپنے لیے قانون وضع کریں اور نہ ہر شخص میں قانون سازی کی صلاحیت ہی ہوتی ہے، اس لیے یہ طریقہ تجویز کیا گیا کہ قوم اپنے نمائندے منتخب کرے جو اس کے لیے قانون بنائیں۔ ان نمائندوں کا بنایا ہوا قانون گویا قوم کا اپنا بنایا ہوا قانون ہوگا۔ کیوں کہ یہ نمائندے اس کے معتمد اور اس کے خیالات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جب تک نمائندے قوم کی ترجمانی کریں گے اور ان پر اس کو اعتماد ہوگا وہ ان کو باقی رکھے گی اور اگر وہ اس کی مرضی اور خواہش کو نظر انداز کریں گے تو وہ اپنا اعتماد کھودیں گے اور قوم ان کو معزول کردے گی۔ اس مقصد کے لیے قوم کو ہر چند سال بعد موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے نمائندوں کے متعلق اپنی مرضی کا اظہار کرسکے۔ یہ قانون سازی کا جمہوری تصور ہے۔

لیکن جمہوریت پر بھی اسی طرح کے اعتراضات واقع ہوتے ہیں جیسے آمریت پر واقع ہوئے تھے۔ کیوں کہ جمہوریت کے تجویز کردہ حل میں بھی ساری قوم کے خیالات کی ترجمانی نہیں ہو پاتی، صرف ایک چھوٹی سی تعداد کی ترجمانی ہوتی ہے۔ قوم کا تقریباً نصف حصہ تو ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن کی عمر اور صلاحیت ہی اتنی نہیں

ہوتی کہ وہ کسی معاملے میں اپنی رائے دے سکیں اور جو لوگ سن و سال کے لحاظ سے اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنے نمائندے منتخب کریں ان میں بھی ایک بڑی تعداد کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی کہ کیا قانون بنے گا اور کون بنائے گا۔ اگر تھوڑی بہت دل چسپی ہوتی بھی ہے تو عملاً وہ اس سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ ان حالات میں مختلف پارٹیاں اور بعض افراد اپنا پروگرام اور منصوبہ پیش کرتی ہیں۔ جس پارٹی کو رائے دینے والوں کی 'اکثریت' حاصل ہوتی ہے اسی کو حکومت کا حق ملتا ہے، خواہ یہ 'اکثریت' مخالف پارٹیوں کے مقابلہ میں 'اقلیت' ہی کیوں نہ ہو۔ فرض کیجیے کسی جگہ رائے دینے والے پچاس ہزار ہیں اور ان کے سامنے دس قسم کی رائیں ہیں اگر ان رایوں میں سے کسی رائے کو پانچ ہزار سے کچھ ہی زائد افراد کی حمایت حاصل ہو تو جمہوریت اس کو ان پچاس ہزار افراد کی نمائندہ رائے مانے گی۔

غرض یہ کہ جمہوریت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زیادہ سے زیادہ دس فی صد افراد کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ان دس فی صد افراد کے متعلق کیا یقین کہ وہ بقیہ نوّے فی صد افراد کی بھی صحیح ترجمانی کریں گے اور ان کے بہی خواہ و خیر اندیش ہوں گے؟ پھر جمہوریت قوم کی رائے کے اظہار کے لیے جو وقفہ مقرر کرتی ہے اس میں ان دس فی صدی افراد کی بھی رائیں بدلتی رہتی ہیں جن کی یہ نمائندے ترجمانی کرتے ہیں اور ایسے افراد تو بہت ہوتے ہیں جو اس وقفے کے آغاز میں رائے دینے کے قابل نہیں ہوتے اور اس کے درمیان میں قابل ہوجاتے ہیں۔ آخر ان سب کی ترجمانی کا حق یہ نمائندے کیسے ادا کرسکتے ہیں؟

ان اعتراضات کو آج تک جمہوریت کا بڑے سے بڑا مدعی بھی حل نہ کرسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت آمریت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ آمریت میں اقتدار ایک فرد کے اندر مرتکز ہوتا ہے اور جمہوریت میں یہ ایک چھوٹی سی جماعت کے ترجمان گروپ میں منتقل ہوجاتا ہے۔ کسی جمہوری نظام کو چلانے کے لیے قوم کی تائید کی

جتنی ضرورت ہوتی ہے ایک آمر بھی اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے اتنی تائید کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ بھی قوم کے ایک خاص حصہ کو خوش رکھنے اور مطمئن رکھنے پر مجبور ہے، ورنہ اس کا اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔

نظریات، سماجی تعلقات اور قانون، انسان ہمیشہ ان ہی تین مسائل میں الجھا رہا ہے۔ وہ ان کا ایک حل ڈھونڈتا ہے۔ جب وہ تجربات کی دنیا میں غلط ثابت ہوتا ہے تو بہ صد حسرت و یاس ایک نئے حل کی تلاش میں سرگرمِ سفر ہوجاتا ہے۔ جب اس سے بھی اس کی الجھنیں رفع نہیں ہوتیں تو اپنی ناکامی کا اعلان کرکے ایک تیسرا حل ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ غلط نظریات، غلط اخلاقیات اور غلط قوانین کے گرداب سے نکلنے نہیں پاتا کہ پھر اسی میں پھنس جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کو کسی آسمانی و زمینی مصیبت نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا نقصان کہ ان نظریات نے پہنچایا جنھیں خود اس نے گھڑا تھا۔ وباؤں اور امراض نے اس کو جتنا تباہ کیا اس سے کہیں زیادہ غلط اخلاقیات سے وہ تباہ ہوا۔ اس کے بنائے ہوئے قوانین کی تلوار نے جس بے دردی سے اس کا خون بہایا کسی سیلاب اور آندھی نے بھی اس سنگ دلی اور شقاوت کا ثبوت نہیں دیا۔

مظلومیت کی اس طویل داستان میں ہمیں ایسے وقفے بھی ملتے ہیں جن میں انسان سکون اور چین سے ہم کنار ہوا ہے اور اس کو صحیح نظریات، صحیح اخلاقیات اور صحیح قوانین کی دولت ملی ہے۔ یہ وقفے گو بہت مختصر ہیں، لیکن یہ تاریخ کی پیشانی کا نور ہیں۔ ان سے صرفِ نظر کرنے کے بعد تاریخ میں ہر طرف گھپ اندھیرا ہے۔ تاریخ کو یہ نور اسلام نے بخشا ہے جس کو ہر دور میں خدا کے برگزیدہ بندے دنیا کے رو برو پیش کرتے رہے ہیں۔ آئندہ صفحات میں اسی تب و تاب کی ایک جھلک آپ کو نظر آئے گی۔ کاش آج کا بھٹکا ہوا انسان اس روشنی میں اپنا سفر طے کرتا۔ منزل اس کا استقبال کرتی اور تاریخ ایک کام یاب سفر کی داستان مرتب کرتی، لیکن کیا ابھی وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہے؟

❁

مسائلِ حیات کا اسلامی حل

عقائد و نظریات

اسلامی نظریات کی بنیاد بعض ایسی حقیقتوں پر ہے جن کا ادراک ہم اپنے حواس سے نہیں کرسکتے، لیکن ہمارا مطالعہ اور مشاہدہ ان کی پوری پوری تائید کرتا ہے۔ غیر اسلامی نظریات اور اسلامی نظریات میں فرق یہی ہے کہ غیر اسلامی نظریات یا تو انسان کے شب و روز کے مشاہدات ہی کو جھٹلاتے ہیں یا ان کے فطری اور منطقی نتائج کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، لیکن اسلام جو نظریات پیش کرتا ہے وہ اس کائنات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ ان کو ماننے سے نہ تو انسان دن کو رات اور رات کو دن کہنے پر مجبور ہوتا ہے اور نہ اسے اپنے کسی تجربہ و تحقیق کی تردید کرنی پڑتی ہے۔

غیر اسلامی نظریات دو طرح کے تصوّرات پیش کرتے ہیں۔ ایک شرک کا تصور، دوسرے مادیّت کا تصوّر۔

شرک

شرک کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے میں بہت سی ہستیاں شریک ہیں۔ کسی نے پانی کو پیدا کیا، کسی نے ہوا کو، کسی نے رزق کو پیدا کیا، کسی نے آگ کو، کسی نے موت و حیات کو اور کسی نے نور و ظلمت کو ــــ اور وہی ان پر تصرف کر رہی ہیں۔ پانی کا خالق پانی برساتا ہے اور رزق کا خالق غلّہ اگاتا ہے۔ موت و حیات کا

خالق زندگی عطا کرتا اور مارتا ہے، نور وظلمت کا پیدا کرنے والا روشنی اور تاریکی پر تصرف کرتا ہے۔ تصورِ شرک اپنے اس دعویٰ کی دلیل یہ دیتا ہے کہ اگر اس کائنات کو کسی ایک ہستی نے پیدا کیا ہوتا تو متضاد قوتیں کام کرتی ہوئی نہ پائی جاتیں، بل کہ یہاں اتحاد اور یکسانیت ہوتی۔ تعمیر کے ساتھ تخریب کا عمل خود بتاتا ہے کہ اقتدار کی مالک یہاں تنہا کوئی ایک ہستی نہیں ہے، بل کہ بہت سی ہستیاں اپنی اپنی مرضی چلا رہی ہیں۔ شرک یہ تصوّر نہیں کرسکتا کہ جس ہاتھ نے کسی نقش کو ابھارا ہو وہی اس کو مٹا دے گا۔ وہ اگر یہ تسلیم بھی کرتا ہے کہ اس کائنات کو صرف ایک ہستی نے وجود دیا ہے تو اس پر تصرف و اقتدار ایک سے زائد ہستیوں کا مانتا ہے، ایسا اقتدار جن کو کائنات کا اصل خالق بھی چیلنج نہیں کرسکتا۔

اس کائنات کے نوع بہ نوع اور مختلف مظاہر کو دیکھ کر یہ سمجھنا کہ ان کے پیچھے مختلف قوتیں کام کر رہی ہیں، نادانی ہے، کیوں کہ یہاں مظاہر مختلف ہیں، ـــــ حقیقت مختلف نہیں ہے۔ یہ کائنات ایک ضابطہ اور ایک اصول کے تحت چل رہی ہے۔ اس سے اختلاف کہیں نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کائنات میں عروج اور زوال دونوں ہی ہیں، لیکن ایک قانون کے تابع۔ پھول جس ضابطہ کے تحت شگفتگی قبول کرتا ہے وہی ضابطہ اس کی پژمردگی کا سبب بنتا ہے۔ یہ کائنات متضاد قوتوں کی آماج گاہ اس وقت قرار دی جاتی جب کہ وہ کسی ایک اصول پر قائم نہ ہوتی۔

قطع نظر اس سے کہ تصورِ شرک اس کائنات کی جو توجیہ کرتا ہے وہ واقعہ کے خلاف ہے، انسان کا مسلسل تجربہ بھی اس کو غلط قرار دیتا ہے، کیوں کہ انسان نے تاریخ میں اب تک جو سب سے بڑا تجربہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی اقتدار دو برابر کے حصوں میں تقسیم ہوا لازماً اختلاف و انتشار پایا گیا، لیکن ہم اس کائنات میں غیر معمولی توازن اور انتہائی ہم آہنگی دیکھتے ہیں۔ یہاں کئی خداؤں کی حکم رانی ہوتی تو اس توازن اور توافق کا پایا جانا ناممکن تھا۔ جس طرح کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ ایک وقت میں دو آقاؤں کی اتباع کرے، اسی طرح اس کائنات میں ایک سے دوسرا اقتدار نہیں چل سکتا۔ اگر زمین کا انتظام ایک کے ہاتھ میں ہے اور آسمان کا دوسرے کے ہاتھ میں تو

دونوں میں اتفاق و اتحاد کیسے پیدا ہوگیا کہ ان کے انتظام میں کہیں تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہے؟ آفتاب جس کے حکم سے گردش کر رہا ہے اگر چاند پر بھی اسی کا حکم جاری نہیں ہے تو کون سی قوت دونوں کو ایک نظام میں جکڑے ہوئے ہے؟ سمندر اور خشکی پر دو الگ الگ فرماں روا حکومت کر رہے ہیں تو وہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

زمین پر جو روئیدگی ہم دیکھتے ہیں یہ اس وقت تک پائی نہیں جاسکتی جب تک کہ اس کے لیے مناسب فضا اور ماحول نہ ملے، سورج ایک خاص مقدار سے گرمی نہ پہنچائے، بادل سے پانی نہ برسے، رات اور دن کا انقلاب نہ آتا رہے۔ اگر سورج اور بادل کا نظام اور رات اور دن کا انقلاب کسی ایک ہستی کے قبضہ میں نہیں ہے تو ایک چھوٹے سے پودے کی نشو و نما کے لیے یہ ساری چیزیں ایک خاص تناسب کے ساتھ کیسے اکٹھا ہوجاتی ہیں؟

اسی طرح انسان اور دوسری جان دار مخلوقات کی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے مناسبِ حال آب و ہوا، غذا اور دوسری ضروریات فراہم ہوں۔ اگر یہ ضروریات ایک خاص تناسب کے ساتھ فراہم نہ ہوں تو ان کا وجود ناممکن ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جان دار اپنے وجود اور بقا کے لیے جن چیزوں کا جس مقدار میں محتاج ہے وہ اسی مقدار میں اس کو مل رہی ہیں۔ نہ ان میں کمی ہوتی ہے نہ بیشی۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ پانی ضرورت سے زیادہ حاصل ہو اور ہوا ضرورت سے کم ملے۔ اس کے پاس سونے اور چاندی، لوہے اور کوئلے کا ذخیرہ تو بہت ہو لیکن غلّہ سے وہ محروم رہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کو صرف ایک ہستی اپنے اقتدار اور بصیرت سے چلا رہی ہے۔ ورنہ ان مختلف عناصر میں توازن نہ پایا جاتا۔ کبھی ہوا اس قدر بڑھ جاتی کہ اس سے زمین کی نمی ختم ہوجاتی اور کبھی پانی کی اس قدر کثرت ہوتی کہ زمین سکونت کے قابل نہ رہتی۔

اب شرک کے اس تصوّر کو لیجیے کہ اس کائنات کا خالق تو ایک ہے، لیکن اس پر حکم ایک سے زائد قوتوں کا چل رہا ہے۔ یہ تصوّر انسان کی فطرت سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ انسان اس دنیا میں آتے ہی جن چند ابتدائی امور کا احساس کرتا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جس چیز کے بنانے اور تیار کرنے میں تنہا اس نے اپنی قوت صرف کی ہو اس پر قبضہ بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ کسی دوسرے شخص کو اس پر تصرف کا کوئی حق نہیں ہے، انسان کا یہ فطری احساس اس تصوّر کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ آسمان اور زمین کے اس حیرت انگیز کارخانے کو جس ہستی نے پیدا کیا تنہا وہی اس کی مالک نہیں ہے، بل کہ اس کی ملکیت میں بہت سی دوسری ہستیاں بھی شریک ہیں۔

انسان کا ضمیر اور اس کے جذبات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جو اس کائنات کا خالق ہے وہی اس کا جائز مالک اور حاکم بھی ہے۔ اسی کا حکم اس کائنات میں چلنا چاہیے۔ اس کائنات کی تخلیق میں جن کا کوئی حصہ نہیں آخر وہ کس بنیاد پر اس کے مالک اور فرماں روا قرار پا سکتے ہیں؟

اگر یہ کہا جائے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اس کا انتظام دوسروں کے حوالے کرکے خود فارغ ہوگیا تو یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ کیا اس کائنات کا نظم و نسق اس کے خالق کے لیے اتنا بھاری تھا کہ وہ اپنا بوجھ دوسروں کے سر ڈال کر خود معطّل ہوگیا؟ اگر واقعہ یہی ہے کہ اس کائنات کے انتظام سے اس کا پیدا کرنے والا عاجز ہے تو دنیا کی وہ کون سی ہستی ہے جس میں اس بارِ عظیم کے اٹھانے کی طاقت ہے؟

مشرکانہ ذہن اس خلافِ عقل تصوّر کو معقول ثابت کرنے کے لیے کبھی ایک دوسرے رنگ میں اسے پیش کرتا ہے، وہ یہ کہ خالقِ کائنات کے دربار میں اس کی بعض مخلوقات کو اس قدر دست رس حاصل ہے کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا، لیکن اس سے خود خالق کائنات کا تصوّر ہی مجروح ہوجاتا ہے، کیوں کہ زمین اور آسمان،

سورج اور چاند، خشکی اور تری کے خالق کے بارے میں یہ انتہائی سوءِ ظن ہے کہ اس کی بعض مخلوقات کو اس پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہوجائے۔ ایسی بے بس اور مجبور ہستی، جو کسی جان دار یا بے جان ہستی کے تابع ہو، اس کے متعلق یہ سوچنا بھی حماقت ہے کہ وہ اس لمبی چوڑی کائنات کی تخلیق کرسکتی ہے۔

غرض یہ کہ شرک کا ہر تصوّر انسانی فطرت کے لیے نامانوس اور اس سے بہت دور ہے۔ اس کو وہی شخص قبول کرسکتا ہے جس کی فطرت پر پردے پڑ چکے ہوں۔

مادّیت

اب مادّیت پر غور کیجیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کو کسی باشعور ہستی نے نہیں پیدا کیا، بل کہ یہ ایک ایسے مادّے سے وجود میں آئی ہے جو اپنے اندر حرکت رکھتا تھا اور اپنی اسی حرکت سے از خود مختلف سیاروں کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ اس کے نتیجے میں کہیں سورج، کہیں چاند، کہیں مرّیخ، کہیں ہماری یہ زمین اور ان کے علاوہ دوسرے سینکڑوں ہزاروں سیّارے وجود میں آگئے اور پھر آہستہ آہستہ ہر سیّارے میں اس کے مناسب حالات بھی اکٹھا ہونے شروع ہوگئے۔ اسی بے جان مادّے سے جان دار اور بے جان، باشعور اور بے شعور، جامد و متحرک ہر طرح کی چیزیں وجود میں آنے لگیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی جگہ ایک لمبے عرصے تک مسلسل کنکر اور پتھر پھینکے جاتے رہیں۔ اس سے کہیں پہاڑ تیار ہوجائے، کہیں عمارت بن جائے، کہیں نالہ اور نہر، کہیں سڑکیں اور پل اور کہیں سرائے اور ہوٹل تعمیر ہوجائے۔ اسی کنکر اور پتھر کے ڈھیر سے انسانوں اور حیوانوں کا سلسلہ بھی جاری ہوکر دھیرے دھیرے وہاں ایک باقاعدہ اور منظم بستی آباد ہوجائے۔

کائنات کی یہ توجیہ انسان کی عقل اور اس کے تجربات کے یک سر خلاف ہے۔ انسان کے ماضی کا طویل تجربہ اور حال کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ آج تک از خود نہ کوئی ملک

فتح ہوا، نہ کوئی چمن آراستہ ہوا، نہ کوئی کارخانہ وجود میں آیا، حتیٰ کہ کوئی مضمون اور کوئی خط اپنے آپ تحریر میں نہیں آیا۔ ایک معمولی سا تنکا بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا جب تک کہ کوئی اس کو حرکت نہ دے۔ اور جو کام جتنا بڑا ہو اس کے لیے اتنے ہی غور وفکر، محنت، توجہ اور منصوبہ سازی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک حسین عمارت اور ایک اعلیٰ مشین اس وقت وجود میں آتی ہے جب کہ بہترین صلاحیت رکھنے والے افراد اپنی ذہنی و عملی کوششیں اس کے لیے صرف کرتے ہیں۔

انسان اپنے تجربے کے خلاف کیسے تصوّر کرسکتا ہے کہ یہ وسیع اور لا محدود کائنات کسی پیدا کرنے والے کے بغیر ہی وجود میں آگئی۔ یہ کائنات جس کے اندر کہیں کوئی خلا اور کوئی رخنہ نہیں پایا جاتا، جس کی ہر شئی اپنے حسن و کمال کے لحاظ سے ایک عظیم واقعہ ہے اور اپنے اپنے مقام پر اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ اگر اس کو وہاں سے جدا کردیا جائے تو اس کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے۔ یہ سورج، چاند، یہ ہماری زمین اور بے شمار سیارے ایک خاص توازن کے ساتھ اپنے اپنے دائروں میں گردش کر رہے ہیں۔ اس توازن میں ذرّہ برابر فرق آجائے تو یہ کائنات آناً فاناً ختم ہوجائے۔ انسان یہ سوچ کر ہی حیران رہ جاتا ہے کہ کیا کوئی اندھا اور بہرا ہاتھ کسی کام میں اس قدر نظم اور ہم آہنگی پیدا کرسکتا ہے؟

پھر کیا بے شعور مادّہ کی اتفاقی حرکت ہی نے آگ میں حرارت، پانی میں ٹھنڈک، پتھر میں سختی، موم میں نرمی، امرت میں حیات اور سنکھیا میں موت رکھ دی؟ کیا اسی سے مقناطیس کے اندر جذب وکشش کی اور لوہے کے اندر انجذاب کی خصوصیت پیدا ہوگئی؟ ایک ہی زمین میں کیا اتفاق ہی سے لوہا اور کوئلہ، سونا اور چاندی، نمک اور دوسری معدنیات جمع ہوگئیں؟ کیا یہ اتفاق ہی ہے کہ کائنات کی مختلف و متضاد چیزوں میں سبب اور مسبّب اور علت ومعلول کا سلسلہ قائم ہے؟ سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بخارات اور بھاپ کی شکل میں اوپر اٹھتا ہے، ہوا ان کو فضا میں پھیلا دیتی ہے،

زمین کی کشش ان بخارات کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ پانی بن کر برسنے لگتے ہیں، اس سے زمین کو روئیدگی اور نشو ونما ملتی ہے اور یہ ذریعہ بنتی ہے ان تمام چیزوں کی زندگی اور حیات کا جو یہاں رہتے اور بستے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہی کا کرشمہ ہے؟

مادّیت کا تصوّر نہ تو اس کائنات کے اندر کسی طرح فٹ ہوتا ہے اور نہ انسان کی عقل اور اس کا تجربہ اس کی تائید کرتے ہیں؟ لیکن اس کو اس لیے قبول کرلیا گیا کہ انسان اس کائنات کی کوئی مادّی اور محسوس توجیہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ پہلے طے کرلیا کہ اس کائنات کی حقیقت اس کے ظاہر کے اندر محدود ہے۔ اس پردے کے پیچھے کوئی کارفرما قوت نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ ایک مفروضہ ہے۔ اس مفروضہ پر اس نے اب تک کوئی قطعی دلیل نہیں فراہم کی۔ یہ اس کی بے جا جسارت ہے کہ اپنی حدِ نگاہ سے آگے کسی شئی کے وجود سے انکار کردیا اور اپنی لاعلمی کو علم و یقین کا نام دے کر کائنات کی ایسی توجیہ پر اصرار کرنے لگا جس کا وہ دو اور دو چار کی طرح تجربہ کرسکے اور جس کی تصدیق حواس کے ذریعہ اس کے لیے ممکن ہو، حالاں کہ اس کائنات کی کسی محسوس توجیہ کے لیے جس وسیع علم اور مشاہدے کی ضرورت ہے وہ ابھی تک اس کو حاصل نہیں ہے۔ یہ کرۂ ارض جس پر وہ رہتا بستا ہے اس کے متعلق بھی اس کی معلومات بہت محدود ہیں اور کائنات کا بیش تر حصہ تو اس کے لیے ایک راز ہے اور جو نئی نئی معلومات دریافت ہو رہی ہیں وہ اس کو اس اتھاہ کائنات کے بارے میں عجز و بے بسی کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں۔

ان مختصر سی معلومات کو لے کر انسان اس وسیع کائنات کے آغاز و انجام کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ ان کی بنیاد پر صرف قیاس کرسکتا ہے۔ اس کے پاس حقیقت کو جاننے کا کوئی قطعی اور یقینی ذریعہ نہیں ہے۔

حقیقت کا علم

اسلام حقیقت کا علم ہمیں عطا کرتا ہے۔ وہ کائنات کا ایسا تصوّر پیش کرتا ہے جس سے وہ تمام سوالات حل ہوجاتے ہیں جو شرک اور مادّیت نے پیدا کیے تھے۔ اس

سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ اس میں نظم و تناسب کیسے قائم ہے؟ اور وہ چل کیسے رہی ہے؟

وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آئی، بل کہ اس کو ایک پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں تنہا اور منفرد ہے، کوئی اس کا ہم سر اور شریک نہیں، اس کا نہ کوئی مشیر ہے اور نہ معاون و مددگار۔ اس کا اقتدار سب سے اونچا، وسیع اور لامحدود ہے۔ یہ ساری کائنات اس کے فرمان کی تابع اور مطیع ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر نہ تو کوئی درخت کا پتہ گر سکتا ہے اور نہ چیونٹی رینگ سکتی ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں اور وہی ان کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں جو کسی کی کوئی مراد پوری کر سکے۔ وہ دانا و بینا اور حکیم ہے اور انتہائی حکمت اور بصیرت کے ساتھ اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس کے کسی کام میں عیب اور نقص کی کوئی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ خیر و خوبی کا سرچشمہ اور غلطیوں اور خامیوں سے سراسر پاک ہے۔

اس تصوّر کی تائید کائنات میں ہر طرف سے ہوتی ہے۔ یہاں کی چھوٹی بڑی ہر چیز، خواہ وہ کرۂ آفتاب ہو یا خاک کا ننھا سا ذرّہ، ایک صاحب اقتدار ہستی کی محتاج ہے۔ اس کے بغیر نہ تو اس کا وجود ممکن ہے اور نہ وہ اپنا کام کر سکتی ہے۔ زمین اور آسمان کی حرکت، سیّاروں کی گردش، ہوا اور پانی کا انتظام خود بول رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔

اس تصوّر کے علاوہ کوئی دوسرا تصوّر، کائنات پر نہ تو پوری طرح منطبق ہوتا ہے، اور نہ اس سے اس کائنات کی مکمل توجیہ ہوتی ہے۔

یہی تصوّر انسان کے لیے سب سے زیادہ قابلِ قبول ہے، کیوں کہ یہ اس کی عقل اور تجربات سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ کسی وجود کا تصوّر نہیں کر سکتا جب تک کہ کوئی اس کو وجود میں لانے والا نہ ہو اور نہ کبھی اس کو اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کائنات کی کوئی مادّی یا مشرکانہ توجیہ اگر انسان کے سامنے نہ لائی جائے تو وہ اس کو دیکھ کر فوراً یہی کہے گا کہ اس کو ایک قادرِ مطلق ہستی نے پیدا کیا ہے اور وہی اس کو چلا رہی ہے۔ اس کائنات

کے مطالعہ سے انسان کے اندر جو احساس ابھرتا ہے اسلام اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اسلام کا تصوّرِ کائنات ہی انسان کی فطرت اور اس کے جذبات و احساسات سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ کسی اور تصوّر سے اس کے جذبات کی تکمیل اور آسودگی نہیں ہوتی۔

انسان اس کائنات کے اندر ہزار ساز و سامان کے باوجود خود کو انتہائی بے بس اور مجبور پاتا ہے۔ ایک طرف اس کے فطری تقاضے، تمنّائیں اور ولولے ہیں اور دوسری طرف ان کی تکمیل کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹیں۔ یہ رکاوٹیں قدم قدم پر اس کے جذبات کو مجروح کرتی اور اس کے احساسات کو صدمہ پہنچاتی ہیں۔ انسان بسا اوقات ان صدموں کو برداشت نہیں کر پاتا اور مایوسی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی غذا فراہم کرنا چاہے یا لباس، کوئی مادّی ضرورت پوری کرنا چاہے یا جذباتی اور نفسیاتی سکون حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ اس کو ہمیشہ میسر نہیں آتے۔ ہوا اس کی مرضی سے نہیں چلتی، پانی اس کے حکم سے نہیں برستا، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے ہاتھ میں نہیں ہیں، صحت اور تندرستی پر وہ قدرت نہیں رکھتا۔ وہ قدم قدم پر ایک ایسے سہارے کا محتاج ہے جس پر وہ ہر وقت اعتماد کر سکے۔ وہ طوفان اور آندھی کے گرداب میں پھنس جائے اور اس کو پکارے تو وہ گرداب سے اسے نکال لے جائے، وہ جنگل میں راستہ بھٹک جائے اور اس کو آواز دے تو اسے منزل تک پہنچادے۔ اس کا معصوم اور ننھا بچہ بیمار ہو، تیمار دار مایوس ہوجائیں، ڈاکٹر جواب دے جائے، ایسے میں اگر وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو اس کے ہاتھ مراد سے بھر جائیں، غرض یہ کہ جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ اس کی ہر مشکل میں کام آ سکتا ہے اور اس کی ہر احتیاج کو پورا کر سکتا ہے۔

انسان کی آنکھیں ایک ایسی ہستی کی تلاش میں ہیں اور اس کی فطرت کہتی ہے اس کائنات میں اسے ضرور ہونا چاہیے۔ یہ ناممکن ہے کہ جس کائنات میں وہ تمام چیزیں موجود ہوں جن کا انسان اپنے وجود اور بقا کے لیے محتاج ہے وہاں اس کے ایک

ایسے داعیہ کی تکمیل ہی کی کوئی صورت نہ ہو جو ہر آن اس کے اندر ابھرتا رہتا ہے۔ جو کائنات ہوا اور پانی سے لے کر زندگی کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت پوری کر رہی ہو، کیا وہ انسان کی وہی ضرورت پوری نہیں کرے گی جو اگر پوری نہ ہو تو یہ ساری چیزیں اس کے لیے بے کار ہیں۔

اسلام اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کی یہ تلاش، تلاش بے جا نہیں ہے، بل کہ اس کائنات میں ایک ایسی مقتدر ذات ہے جس کے دامن میں انسان پناہ لے سکتا ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ اس کی تائید ہزاروں لاکھوں نیک اور برگزیدہ افراد کرتے ہیں۔ یہ افراد زمین کے ہر گوشہ میں اور ہر دور میں ملتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی ہستی پر اپنے ایمان و یقین کا اظہار کیا ہے جو ان کی دعائیں سنتی ہے، جس سے وہ مانگتے ہیں تو ان کی مرادیں پوری ہوجاتی ہیں، وہ اس کے سامنے اپنا سر عجز رکھتے ہیں تو اس سے قرب محسوس کرتے ہیں، وہ اس کے جلال اور عظمت کا ہر وقت مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کو ہر طرف اسی کی قدرت کا کرشمہ نظر آتا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان سارے انسانوں نے جھوٹ کہا ہے جب کہ ہم ان کی زندگی میں جھوٹ اور مکر و فریب کی کوئی علامت نہیں دیکھتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دھوکا کھا گئے یا ان پر کسی کا جادو چل گیا، کیوں کہ وہ وقت کے دانا اور صاحب بصیرت اور ہوشیار انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک ایک ادا بتاتی ہے کہ وہ نہ فریب خوردہ ہیں اور نہ ان پر جادو کیا گیا ہے۔

انسان کا امتحان

جب اس کائنات میں ایک ایسی با اقتدار ہستی ہے جس کا حکم ہر چیز پر چل رہا ہے تو انسان کو بھی اس کا مطیع و منقاد ہونا چاہیے۔ آسمان اور زمین، سورج اور چاند جس کے امر و اقتدار کے تابع ہیں، لازم ہے کہ انسان بھی اس کے اقتدار میں جکڑا ہوا ہو،

لیکن انسان آزاد ہے وہ اپنے اور اس کائنات کے خالق کو مانتا بھی ہے اور نہیں بھی مانتا، اس کی اطاعت و فرماں برداری کی بھی طاقت رکھتا ہے اور نافرمانی کی بھی۔ یہ کیوں؟

اس کا جواب اسلام نے یہ دیا ہے کہ یہاں انسان کی اصل حیثیت کا امتحان ہو رہا ہے کہ آیا وہ اس پر باقی رہتا ہے یا اس سے انحراف کرتا ہے؟ اپنے خالق و مالک کی غلامی کرتا ہے یا اس کا باغی اور نافرمان بنتا ہے؟ اس مقصد کے لیے ضروری تھا اس کو کسی جگہ پتھر کی طرح نصب نہ کر دیا جاتا اور نہ حرکت کرنے والی مشین بنا دیا جاتا، بل کہ اس کو مطلوب و نامطلوب دونوں طرح کی روش پر عمل کی یکساں آزادی دی جاتی، کیوں کہ آزادی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے کسی چیز کا امتحان ہوسکتا ہے۔ انسان کے علاوہ اس کائنات کی دوسری تمام چیزیں اپنے خالق کے حکم کی تابع ہیں اور اس کے حکم سے بال برابر اختلاف نہیں کرسکتیں، اس لیے ان کی آزمائش بھی نہیں ہے؟

اس مقصد کے لیے انسان کے حق میں ساری کائنات کو ایک امتحان گاہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کو اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ انسان اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرسکتا ہے۔ زمین پر اگنے والے غلے سے توانائی حاصل کرکے وہ اپنے آقا و مالک کی اطاعت و غلامی بھی کرسکتا ہے اور اسی توانائی کو اس کی بغاوت میں بھی صرف کرسکتا ہے۔ سورج کی گرمی سے خدا کے نیک بندے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور بدکردار بھی۔ اس دنیا میں جو اسباب و وسائل پھیلائے گئے ہیں ان کو استعمال کرکے ایک مجرم بھی کام یاب ہوسکتا ہے اور نیکوکار بھی۔ ایسا نہیں ہے کہ صحیح مقصد ہی کے لیے وہ کام آئیں اور غلط مقصد کے لیے کام نہ آئیں۔

جس طرح کسی مملکت کا سربراہ ان نائبین کو فوراً اپنے مقام سے معزول کر دیتا اور ان کو سخت سزا دیتا ہے جو اس کی مملکت میں اس کی مرضی کے خلاف عمل کریں اس طرح اس کائنات کا حقیقی مالک انسان کے غلط اقدامات پر فوراً باز پرس نہیں کرتا اور نہ اس کی صحیح روش پر فوراً انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔

جزا و سزا

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو اس کے عمل کا بدلہ نہیں ملے گا۔ خالقِ کائنات کے فرماں بردار اور نافرمان، اطاعت گزار اور باغی سب کا انجام ایک رہے گا اور وہ اپنے کردار کے نتائج سے کبھی دو چار نہ ہوں گے۔ کیوں کہ یہ بات اس کائنات کی فطرت کے خلاف ہے، خالقِ کائنات کے تصوّر کے خلاف ہے اور جس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس مقصد کے خلاف ہے۔

جس کائنات کا ایک ایک ذرّہ اپنے اندر خاصیت رکھتا ہے کیا اس میں انسان کے اعمال ہی ایسے ہیں جن میں کوئی خاصیت نہیں؟ آگ میں گرمی اور پانی میں ٹھنڈک ہے تو کیا ان سے زیادہ تاثیر رکھنے والے اعمال خصوصیات سے خالی ہوں گے؟ زمین میں جو دانے پھینک دیے جاتے ہیں جب وہ ضائع نہیں ہوتے تو کیا وہ عمل جسے انسان شب و روز انجام دیتا رہتا ہے ضائع چلا جائے گا؟ انسان راستہ چلتے ہوئے ٹھوکر کھاتا ہے اور درد محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ تلوار چلا کر کسی خاندان کو تباہ کردے تو کیا اس کے اس ظلم میں تاثیر نہ ہوگی؟ اگر بارش کی بوندوں سے زمین لہلہا اٹھتی ہے تو کیا انسان کے وہ اعمال جن سے دنیا میں چین اور سکون، امن اور راحت عام ہو وہ لاحاصل ہی رہیں گے؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔ ہر عمل پر اس کی تاثیر لکھی ہوئی ہے، لیکن اس کے ظاہر ہونے کا وقت یہ نہیں ہے۔ جس طرح ایک چھوٹے سے دانے میں پورا درخت چھپا ہوا ہے اور وہ اپنے ظہور کے لیے اس بات کا محتاج ہے کہ اس کو زمین میں دفن کیا جائے، اسی طرح انسان کے اعمال میں چھپے ہوئے اچھے اور برے نتائج اس وقت ظاہر ہوں گے جب کہ امتحان کی مدت ختم ہوگی۔ اس دن خالقِ کائنات اپنی عدالت قائم کرے گا اور جس مقصد کے لیے اس نے انسانوں کو عمل کی آزادی دے رکھی تھی اس کو جنھوں نے پورا کیا ہوگا ان کو وہ انعام و اکرام سے نوازے گا اور جو اس مقصد کو نقصان پہنچانے والے ہوں گے ان سے ان کے کیے کا بدلہ لے گا۔

اگر وہ دن نہ آئے جس میں انسانوں کے اعمال کا حساب ہوگا تو یہ ماننا پڑے گا کہ انسانوں کے خالق کو ان کی نیکی اور بدی سے کوئی دل چسپی نہیں، اس کی نگاہ میں برے اور بھلے ایک ہیں اور وہ جھوٹ اور سچ دونوں کو جائز سمجھتا ہے۔ لیکن جب ہم سیاہ اور سفید اور کھرے اور کھوٹے کو ایک نہیں سمجھتے تو کائنات کا خالق ظلم اور عدل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کو کیسے ایک قرار دے سکتا ہے؟ پھر یہ بات اس کی بے پایاں حکمت کے بھی سراسر منافی ہے کہ وہ انسان کو آزاد چھوڑ رکھے اور اس کے اعمال کا حساب نہ لے، اس لیے عقل کہتی ہے کہ انسان کو عمل کی آزادی دینے والا اس کے کاموں سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا۔ وہ اس کا احتساب ضرور کرے گا۔

رسالت

جزا و سزا اور باز پرس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے حق و باطل اور غلط اور صحیح بالکل واضح ہوجائے، تاکہ وہ حق و صداقت کو اختیار کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہ رہے اور جہالت و نادانی سے اس کو کسی غلطی کا مرتکب نہ ہونا پڑے۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ کس راہ پر چل کر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور ناکامی کی راہ کون سی ہے، اس وقت تک امتحان ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی کو اندھیرے میں کھڑا کر کے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پورب کی طرف جاؤ، پچھّم کی طرف نہ جاؤ اور نہ کسی اندھے سے اس کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی مقصد کے لیے انسانوں میں رسول آتے ہیں۔ وہ خالقِ کائنات کے نمائندے ہوتے ہیں، وہ انسانوں کو بتاتے ہیں کہ ان کے خالق کی مرضی کن کاموں میں ہے اور کن کاموں میں نہیں ہے؟ ان کے لیے صحیح راہ کون سی ہے اور غلط راہ کون سی؟ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ جو شخص ان کی بات مانے اور ان کے نقشِ قدم پر چلے وہ خدا کی مرضی پوری کرے گا اور اس کے انعام و اکرام کا سزاوار ہوگا۔ اور جو ان کے بتائے ہوئے راستہ کو چھوڑے اس پر خدا کا عتاب ہوگا اور وہ بدترین سزا کا مستحق ہوگا۔ یہ انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ رسولؐ کو پہچانے اور اس کے دامن کے ساتھ وابستہ ہوجائے۔ خالقِ کائنات زمین پر آکر یہ اعلان نہیں کرتا کہ فلاں شخص اس کا رسول ہے۔ البتہ رسول

اپنے رسول ہونے پر انسانوں کے سامنے دلائل پیش کرتے ہیں۔ جس طرح اس کائنات کو دیکھ کر ہم اس کے خالق کا اقرار کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح خالقِ کائنات کے رسول کے اوصاف کو دیکھ کر اور اس کے دلائل پر غور کرکے یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ واقعتاً اس کا رسول ہی ہے۔

کسی شخص کے خالقِ کائنات کے رسول ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ قطعیت کے ساتھ بتائے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ کیسے وجود میں آئی ہے؟ کیسے چل رہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ اس کی حیثیت کیا ہے؟ اسے کیا کرنا ہے؟ اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟ کیوں کہ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب دینے کے لیے خدا کی طرف سے رسول دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ اس کی تعلیمات علم و عقل کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔ وہ کوئی ایسا دعویٰ نہ کرے جو کسی جانی پہچانی حقیقت کے خلاف ہو، مشاہدات اور تجربات جس کی تکذیب کرتے ہوں۔ کیوں کہ خالقِ کائنات کا رسول اس کائنات کی کسی حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اس پر وہ باتیں بھی عیاں ہوتی ہیں جن کو جاننے کا عام انسانوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

رسول کے رسول ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ فتنہ و فساد نہ پھیلائے اور اپنے قول و عمل سے خیر و صلاح کی طرف دعوت دے، کیوں کہ کوئی مفسد اور فتنہ پرداز خالقِ کائنات کا باغی اور نافرمان تو ہوسکتا ہے اس کا نمائندہ اور ترجمان نہیں ہوسکتا۔ اس زمین کا پیدا کرنے والا کبھی یہ پسند نہیں کرسکتا کہ اس پر فتنہ و فساد پھیلے۔ وہ اس میں خیر و خوبی دیکھنا چاہتا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اس کے سامنے انسانوں کو ان کے خالق کا پیغام پہنچانے کے سوا کوئی دوسری غرض نہ ہو اور وہ کوئی ذلیل اور گھٹیا مقصد لے کر نہ کھڑا ہو۔ اس کے ساتھ شب و روز رہنے والے اور وہ لوگ جن میں وہ پیدا ہوا اور بڑھا اس پر یہ الزام نہ لگائیں کہ یہ دھوکا باز، مکّار اور جھوٹا ہے اور رسالت کا نام لے کر اپنی دنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس کی طرف کسی قسم کی اخلاقی پستی کا انتساب نہ کیا جائے، کیوں کہ رسالت ایک

عظیم ذمہ داری ہے، اتنی عظیم کہ اس کائنات کے اندر اس سے بڑی عظمت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس عظیم ذمہ داری کی اہلیت کے لیے بلند و برتر اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ ہر شخص کے اندر اپنے خالق کی معرفت کا جذبہ اور صلاحیت ہے۔ وہ فطرتاً اس بات کا مجمل علم رکھتا ہے کہ کائنات کے خالق سے تقرب کی کیا علامتیں ہیں؟ اور جس انسان کو اپنے خالق کا تقرب حاصل ہو اس کے اندر کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے؟ چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ صدیوں سے انسان ان صفات و کمالات پر متفق ہیں جو خدا کے کسی مقرب اور برگزیدہ بندے کے اندر ہونے چاہئیں۔ اس لیے ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ جو شخص خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے آیا واقعتاً وہ خدا کا رسول ہے یا نہیں؟ اس کے اندر وہ صفات پائی جاتی ہیں یا نہیں جو خدا کے نیک بندوں میں پائی جانی چاہئیں؟

دنیا کے اندر جتنے پیغمبر آئے سب کے سب ان معیارات پر پورے اترتے تھے۔ انھوں نے متفقہ طور پر ایک ایسی ہستی کا اعتراف کیا جو تمام قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے، جو اس کائنات کا خالق و مالک اور مدبّر ہے۔ کائنات کی اس توجیہ پر ان تمام پیغمبروں کا اتفاق صاف بتاتا ہے کہ ان کو بہ راہِ راست کائنات کے خالق کی طرف سے یہ معلومات مل رہی ہیں، کیوں کہ آج تک سوائے پیغمبروں کے انسانوں کا اتنا بڑا طبقہ کسی ان دیکھی حقیقت پر متفق نہیں ہوا اور پھر پیغمبروں نے اخلاق اور نیکی کی جو تعلیمات پیش کیں ان کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فتنہ و فساد کا ذریعہ ہیں، کیوں کہ جب بھی ان کا تجربہ کیا گیا اچھے نتائج برآمد ہوئے اور انسانوں کو سکھ، چین اور امن نصیب ہوا۔ ان تعلیمات کو خدا کے پیغمبروں نے دنیا کے روبرو پیش ہی نہیں کیا، بل کہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ان پر عمل کیا۔ وہ مجسم ان تعلیمات کے مظہر تھے۔ ان کے دشمن تک ان کی نیکی اور بھلائی کے معترف رہے۔ کسی نے ان پر کسی اخلاقی جرم کا الزام نہیں لگایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے حد مخلص تھے اور انتہائی سنجیدگی سے اپنی اور دوسروں کی فلاح اسی دعوت میں دیکھتے تھے۔

آخری رسول (ﷺ)

ان ہی خصوصیات اور اوصاف کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی میں حضرت محمد ﷺ نے اپنے رسول ہونے کا اعلان کیا اور دعویٰ کیا کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے، اسی کے حکم سے زمین آسمان قایم ہیں۔ اسی کے ہاتھ میں شب و روز کی گردش ہے۔ وہی موت و حیات کا مالک ہے، وہی صحت اور تندرستی عطا کرتا اور مرض میں مبتلا کرتا ہے، مختصر یہ کہ اس کائنات میں صرف اسی کا حکم چل رہا ہے، اس کی مرضی کے خلاف کسی کو چوں کرنے کی گنجائش نہیں۔ آپ (ﷺ) نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کائنات کی ایک ایک چیز پیش کی اور انسانوں کو دعوت دی کہ وہ اسی کی بندگی اور غلامی اختیار کریں اور جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگیں، کیوں کہ وہی عبادت کا مستحق اور اپنے بندوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔

ذیل میں ہم آپؐ کی تعلیمات کا ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتے ہیں:

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿١٦﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾ وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿٢٠﴾

ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اسے لہو و لعب کے طور پر نہیں پیدا کیا ہے۔ اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھیل کریں تو خاص اپنے پاس سے ایسا ہی کرتے اگر ہمارا یہی ارادہ ہوتا، بل کہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں اور وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے۔ پھر اچانک باطل مٹ جاتا ہے۔ تباہی ہے تمھارے لیے ان باتوں میں جو تم بیان کرتے ہو۔ اسی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے نہ تو سرکشی کرتے ہیں اور نہ کاہلی۔ رات اور دن اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۚ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ (الانبیاء: ۱۶-۲۹)

کیا ان منکرین نے زمین میں سے اپنے لیے معبود بنا لیے ہیں جو ان کو قبروں سے اٹھائیں گے؟ اگر آسمان اور زمین کے اندر اللہ کے سوا بہت سے معبود ہوتے تو ان میں فساد پیدا ہوجاتا۔ پس پاک ہے اللہ عرش کا مالک ان باتوں سے جو یہ کرتے ہیں جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے سوال نہیں کیا جاتا، بل کہ یہ اپنے اعمال کے بارے میں پوچھے جائیں گے۔ کیا انھوں نے سوائے اللہ کے بہت سے معبود بنا لیے ہیں۔ کہو ان سے کہ وہ اپنی دلیل لائیں۔ یہ ذکر ہے ان لوگوں کا جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کا جو مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں، لیکن ان میں سے بیش تر حق کو نہیں جانتے اور وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ ہم نے تم سے پہلے جس رسول کو بھی بھیجا اس کی طرف یہ وحی کی کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے میرے، پس تم میری بندگی کرو۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اپنی اولاد بنا رکھی ہے۔ پاک ہے اس کی ذات اس سے۔ بل کہ جن کو وہ اس کی اولاد بتاتے ہیں وہ اس کے مکرم بندے ہیں۔ وہ بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے ان ساری چیزوں کو جو ان کے آگے ہیں اور جو ان کے پیچھے ہیں۔ یہ فرشتے سوائے اس کے کسی کی سفارش نہیں کرتے جس سے اللہ راضی ہو اور وہ اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو بھی یہ دعویٰ کرے گا کہ بہ جائے خدا کے میں معبود ہوں تو ہم اس کی اس بات پر اس کو جہنم کا بدلہ دیں گے۔ ہم ظالموں کو ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں۔

رسول خدا ﷺ نے ایک خالق و مالک کی پرستش کی جو تعلیم دی، اس کی بنیاد پر زندگی کا پورا نقشہ پیش کیا۔ عبادات کے طریقے اور تعلقات کے اصول بتائے، حدود و تعزیرات اور قوانین مقرر کیے، اٹھنے، بیٹھنے، بولنے، لکھنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے آداب سکھائے۔ پوری زندگی کو خدا کی بندگی کے تابع کردیا اور خدا اور بندہ کے تعلق کو اس طرح استوار کیا کہ کسی گوشہ میں اور کسی حال میں اسے مجروح ہونے نہ دیا۔

یہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو گزشتہ زمانوں میں دوسرے انبیاء دیتے رہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سرچشمۂ علم بھی وہی ہے جو دوسرے انبیاء کے علم کا سرچشمہ تھا۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جو دنیا کے فلسفوں اور حکمتوں سے بالکل ناآشنا تھا، جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا اور جس نے علماء وفضلاء کی صحبتوں میں زندگی بسر نہیں کی، حتیٰ کہ کبھی کسی عالم سے ملاقات تک نہیں کی، وہ ٹھیک ٹھیک وہی باتیں کہے جو صدیوں پہلے سے دوسرے برگزیدہ انسان کہتے رہے ہیں۔

آپؐ نے بغیر کسی سابقہ علم اور مطالعہ کے اچانک خدا کی بندگی کی دعوت دی اور اس یقین کے ساتھ دی کہ آپؐ کی زندگی کی ایک ایک ادا سے یہ یقین جھلکتا تھا۔ آپؐ کے دشمنوں نے آپؐ کو بڑی بڑی اذیتیں پہنچائیں، ہر طرح ستایا، فقر و فاقے پر مجبور کیا، گالیاں دیں، پتھر مار کر زخمی کردیا، یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ آپ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن آپ کے یقین میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی، بل کہ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ آپؐ جس خدا کی طرف دنیا کو دعوت دے رہے تھے اسی خدا کی طرف ہر معاملہ میں رجوع فرماتے، بالکل بے کسوں اور محتاجوں کی طرح اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے۔ رو رو کے اس سے اپنی مرادیں مانگتے۔ آپؐ کو بارہا ایسی حالت میں بھی دیکھا گیا کہ رات کی تنہائی ہے اور آپؐ اپنے رب کے حضور ہاتھ پھیلائے اس کے عذاب سے پناہ طلب کر رہے ہیں اور اس کی رحمتوں کی بھیک چاہ رہے ہیں۔ آپؐ کو

دیکھنے والی ہر آنکھ گواہی دیتی کہ آپؐ ایک ایسی ہستی پر یقین رکھتے ہیں جو اس کائنات کی خالق و مالک اور فرماں روا ہے اور اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں انتہائی بے بس اور عاجز و مجبور پا رہے ہیں۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ آپؐ نے اپنی دنیا بنانے کے لیے یہ سوانگ رچایا، کیوں کہ دنیا نے دیکھا کہ سارے عرب پر اقتدار کے باوجود آپؐ نے ایک فقیر بے نوا کی زندگی گزار دی۔ سامانِ عیش کے ہوتے ہوئے بھی فقر و فاقے کو ترجیح دی۔ اس بات کو بھی پسند نہیں کیا کہ بہ جائے بوریے کے کسی گدّے پر آرام کریں۔ جب آپؐ کے ساتھیوں نے آپ کے لیے نرم بستر تیار کرنے کی خواہش ظاہر کی تو جواب دیا۔ ''یہ دنیا اور میں! '' مجھے اس دنیا سے کیا تعلق؟ میں اس دنیا میں ایک مسافر ہوں۔ جس طرح مسافر کسی سائے کے نیچے کچھ دیر آرام کے لیے ٹھہر جاتا ہے، لیکن اسے اپنی منزل نہیں سمجھتا، اسی طرح یہ دنیا میری منزل نہیں ہے۔

ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ اپنے دعوے میں جھوٹے تھے، کیوں کہ آپؐ کے دشمنوں تک نے آپؐ کے سچے اور صادق ہونے کی شہادت دی ہے۔ جس شخص کے جھوٹے ہونے کا تجربہ زندگی کے کسی معاملے میں نہ ہوا ہو یہ کتنی بڑی زیادتی ہوگی کہ ایک خاص معاملے میں ہم اس پر جھوٹ کہنے کا الزام لگا دیں، جب کہ ہمارے پاس اس کے لیے کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ اگر اس کے دلائل سے ہم مطمئن نہ ہوں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی جھوٹا زیادہ لمبی مدت تک اپنی بات پر جما نہیں رہ سکتا۔ لیکن آپ پورے تیئیس (۲۳) سال تک ایک ہی بات دہراتے رہے اور اس کے خلاف کبھی کوئی کلمہ آپؐ کی زبان سے نہیں سنا گیا۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی جھوٹے کے اردگرد ایسے فداکار جمع ہوجائیں جیسے آپؐ کے اردگرد جمع تھے۔ وہ آپؐ سے ایک ایسی ہستی کی مرضی دریافت کرتے جس کو وہ خود نہیں دیکھ سکتے تھے اور جب آپؐ اس

کی مرضی بتاتے تو ان کو نہ تو اپنا مال قربان کرنے میں تأمل ہوتا اور نہ اپنی جان۔ وہ آپؐ کے اشاروں پر دوڑ پڑتے اور ہر اس بات پر یقین رکھتے تھے جو آپؐ کی زبان سے نکلتی تھی۔ کیا کسی جھوٹے کے ساتھ اس کے پیروؤں کا کبھی یہ سلوک رہا ہے؟

آپؐ نے ایسے متبعین کی ایک جماعت تیار کی اور خدا کی طرف سے نازل کی ہوئی کتاب ان کے حوالے کی اور یہ اعلان کردیا کہ اب رسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا، پیغمبری کی عمارت میں وہ آخری اینٹ رکھ دی گئی جس کی جگہ خالی تھی۔ اب قیامت تک آپ پر نازل کردہ کتاب ہی پر عمل ہوگا۔

آپؐ کو خدا کا رسول تسلیم کرنے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ آپؐ کے ختم رسالت کے دعویٰ کو تسلیم نہ کیا جائے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وہ کتاب جو آپؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی صاف گواہی دے رہی ہے کہ جس مقصد کے لیے انبیاء دنیا میں آتے تھے وہ مقصد پورا ہوگیا۔ اب ان کی آمد کی ضرورت نہیں رہی، کیوں کہ اس کتاب میں قیامت تک کے لیے ابدی اصول موجود ہیں۔

انسانی تعلقات

اختلاف اور نزاع

اگر ماضی، حال اور مستقبل کے سارے انسان کسی جگہ جمع کیے جائیں اور ان سے ان کے جذبات و احساسات اور ان کی ضرورتوں کے بارے میں سوال کیا جائے تو سب کے جوابات ایک سے ہوں گے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں نکلے گا جو خوشی اور غم کے جذبات اور طبعی تقاضوں سے خالی ہو، یا اس کے جذبات دوسروں کے جذبات سے اور اس کے طبعی تقاضے دوسروں کے طبعی تقاضوں سے مختلف ہوں، لیکن اس کے باوجود انسان مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر فرقہ دوسرے فرقہ سے برسرِ پیکار ہے۔ گویا ہر گروہ اور ہر فرد کی فطرت جدا اور ان کی حاجتیں مختلف ہیں۔ ایشیا کا رہنے والا اپنی زندگی کے لیے جن چیزوں کا محتاج ہے یورپ اور امریکہ کا رہنے والا ان سے مستغنی ہے، رومی کے جو جذبات و احساسات ہیں یونانی اس سے متضاد جذبات و احساسات رکھتا ہے۔

جب واقعہ یہ ہے کہ تمام انسان اپنے جذبات، مفادات اور بنیادی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک وحدت ہیں تو وہ کون سی چیز ہے جو ان کو تصادم اور ٹکراؤ کی طرف لے جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان خارجی دنیا میں کسی ایسے مقصد کا متلاشی ہے جس کے گرد اپنی زندگی گھما دے، جس پر اپنی جان و مال اور اوقات کو قربان کرے۔ ایسے کسی مقصد کے بغیر اس کو چین نہیں آسکتا، بل کہ وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس مقصد کو پانے میں انسان متفق نہیں ہیں۔

زندگی کے غلط مقاصد

کسی نے کہا: انسان کی زندگی کا مقصد خاندان اور قبیلے کی خدمت ہے۔ قبیلے کی مدافعت، اس کی تائید و حمایت اور اس کے مفاد کے لیے جدو جہد انسان کا مقدس فرض ہے، کیوں کہ قبیلہ ہی انسان کی پرورش گاہ ہے، وہ اس کو وجود دیتا اور دوڑ دھوپ کے قابل بناتا ہے۔ اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں قبیلے کے احسانات کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس لیے ان قوتوں کا بہترین مصرف بھی قبیلے کی خدمت ہی ہوسکتا ہے۔ وہ انسان کام یاب ہے جس کی قوتیں اور صلاحیتیں اپنے قبیلے کے کام آئیں۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو تنہا وہ قبیلہ نہیں ابھارتا جس میں وہ پیدا ہوا، بل کہ اس کی ترقی اور نشو ونما میں بہت سے خاندان اور قبیلے شریک ہوتے ہیں، اس لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ انسان صرف اپنے قبیلے کے بارے میں سوچے اور اسی کے مفاد کے لیے سب کچھ کرے۔ اس کی خدمات اور قربانیوں کا دائرہ صرف اس کے اپنے قبیلے تک محدود نہیں ہونا چاہیے، بل کہ اسے وسیع تر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ وسعت ان تمام قبیلوں پر حاوی ہوگی جو ایک زبان بولتے ہیں۔ کیوں کہ زبان ہی مختلف قبیلوں کو جوڑنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اسی سے خیالات میں اشتراک پیدا ہوتا ہے اور قبیلے ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں۔

زبان کی وسعت کو بھی بسا اوقات چند سو اور چند ہزار میل کا فاصلہ ختم کردیتا ہے۔ لیکن انسان کی ضرورتیں اور مفادات دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا دائرہ زبان کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے ایسے افراد اور ایسے قبیلوں سے بھی تعلق رکھنے پر مجبور ہے جن کی زبان اس کی زبان سے مختلف ہوتی ہے، اس لیے کہا گیا کہ انسان کے معاشی و سماجی اور دوسرے مفادات عموماً زمین کے اس حصے تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں جس کو قدرتی طور پر پہاڑوں، دریاؤں، ذرائع پیداوار، آب و ہوا

اور موسم کے اشتراک نے ایک کردیا ہے۔ انسان زمین کے اس پورے خطے سے، اس کی ایک ایک چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لیے انسان کا مقصود و منتہیٰ اس پورے خطے کی خدمت ہونی چاہیے، خواہ اس میں کتنی ہی زبانیں بولی جاتی ہوں اور کتنی ہی قومیں اور قبیلے آباد ہوں اور کتنے ہی رنگ و نسل کے افراد بستے ہوں۔ اس سے قومیت کا تصور ابھرا۔

موجودہ دور قوم کی خدمت اور اس کی ترقی کے لیے جدو جہد کو انسان کا اعلیٰ ترین مقصد سمجھتا ہے، اس کے لیے جینا اور مرنا اس کے نزدیک انسانیت کی معراج ہے۔ جو شخص اس مقصد کے لیے فنا ہوجائے وہ اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ اس کی یادگار منائی جائے، اس کے مرنے کے بعد اس کی تصویر کے سامنے تعظیمی آداب بجالائے جائیں اور اس کے ذکر کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کردیا جائے۔

زندگی کے جو مقاصد اوپر بیان کیے گئے ہیں وہ انسانوں کو باہم جوڑنے والے نہیں، بل کہ توڑنے والے ہیں، کیوں کہ ان میں سے ہر مقصد ایک محدود مقصد ہے جو خاص خاص طبقات اور گروہوں کے مفادات کے لیے وجود میں آیا ہے۔ ان میں کوئی بھی مقصد اس سے بحث نہیں کرتا کہ سارے انسانوں کا نفع کس امر میں ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی محدود مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ اس سے وسیع مقاصد کو صدمہ نہ پہنچے۔ اس لیے کسی محدود مقصد کے زیرِ سایہ ان افراد اور قوموں کا جمع ہونا ناممکن ہے جن کے مفادات اس سے مجروح ہوتے ہوں۔ اگر انسان کا مقصدِ حیات چند مخصوص پہاڑوں اور دریاؤں کے درمیان محدود ہو تو اس مقصد سے ان انسانوں کو کیا دل چسپی ہوگی جو اس احاطے سے باہر ہیں اور جو ان پہاڑوں اور دریاؤں سے فائدہ نہیں اٹھاتے؟ اگر کسی کی نظر اپنے ہم زبان افراد کی حد تک جا کر رک جائے تو دوسری زبان والے اس سے کیوں تعلق رکھیں اور محبت کریں؟ اسی طرح اگر انسان کا مرکزِ محبت اس کی اپنی قوم اور قبیلہ ہو تو دوسری قومیں کیوں اس سے وابستہ رہیں جن کے نفع و نقصان سے اسے کوئی دل چسپی نہیں؟

یہی وجہ ہے کہ آج ہر شخص، ہر ادارہ اور ہر قوم کی عقیدت و محبت کا بت جدا ہے اور وہ اپنے بت کو خوش رکھنے کے لیے دوسرے کے بتوں کی مذمت، لعن طعن اور شکست و ریخت میں مصروف ہے۔ ایشیا کا رہنے والا یورپ سے، وہاں کی قوموں اور وہاں پائے جانے والے تعصب اور تنگ نظری سے نفرت اور عداوت رکھتا ہے اور یورپ کا رہنے والا ایشیا کی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، امریکہ کا سینہ افریقہ کے لیے تنگ ہے اور افریقہ امریکہ سے بے زار اور متنفر ہے۔

اس حل کے لیے عالم گیر انسانی برادری کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی تمام قومیں اپنے مشترک مفادات میں متحد ہوجائیں اور ان کے حصول کے لیے مل جل کر جدو جہد کریں۔ خود بھی زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے کا حق دیں۔ لیکن یہ ایک فرضی تصوّر ہے، عمل کی دنیا اس کی تائید نہیں کرتی۔ انسان کے مفادات اس کے نظریات کے تابع ہوتے ہیں۔ انسان صلح و جنگ، دوستی اور دشمنی کے سارے معاملات ان ہی نظریات کی بنیاد پر کرتا ہے۔ نظریات میں اگر تضاد ہے تو مفادات کبھی مشترک نہیں ہوسکتے۔ جو شخص کمیونزم پر ایمان رکھتا ہو سرمایہ داری کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا اس کے لیے ناممکن ہے۔ قوم پرست ذہن مخالف قوم کی ترقی کو آسانی سے برداشت نہیں کرسکتا۔ اختلافِ فکر کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے انسانوں کے درمیان ہمیشہ نزاع اور جنگ رہی ہے۔ آج یہی چیز الفت اور محبت کا ذریعہ بن جائے یہ ناممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس سر زمین سے انسان کو فائدہ نہیں پہنچتا، جس قوم کے عقائد و نظریات اس کے عقائد و نظریات سے مختلف ہوں، جو زبان اس کی زبان سے میل نہ کھاتی ہو اس سے وہ کیوں محبت کرے؟ یہ ایسا فطری سوال ہے کہ اسے رد نہیں کیا جاسکتا۔ اور عالم گیر انسانی برادری کا تصور پیش کرنے والے اب تک اس کے جواب سے عاجز ہیں۔

صحیح نقطۂ نظر

اسلام تمام انسانوں کو ایک وحدت قرار دیتا ہے اور سب کی زندگی کا مقصد بھی ایک متعین کرتا ہے، کیوں کہ سب کا خالق و مالک ایک ہے۔ اس نے ہندی کے لیے الگ اور چینی کے لیے الگ، روسی کے لیے الگ اور امریکی کے لیے الگ مقصد نہیں قرار دیا ہے، بل کہ انسانوں کے پیدا کرنے والے نے زمین پر بسنے والے ہر فرد اور ہر گروہ سے اپنی بندگی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس مقصد کے بارے میں نہ تو عجمی یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صرف عربوں کے لیے ہے اور نہ عرب اس کو عجمیوں کا مقصد قرار دے سکتے ہیں۔ اس میں ہر رنگ و نسل اور ہر خطۂ زمین کے انسانوں کے لیے کشش پائی جاتی ہے۔ اپنے خالق و مالک اور محسن کی طرف بڑھنا اور اس سے قریب ہونا انسان کی فطرت ہے۔ قدم قدم پر وہ اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہے۔ مشکلات میں وہ اس کا سہارا ڈھونڈتا اور خوشیوں میں اس کے احسانات کا شکر بجا لاتا ہے، اس لیے یہ سارے انسانوں کا مقصد ہے۔ اس کو اپنانے میں ہر ایک کا اپنا ذاتی فائدہ ہے اور اس کے ٹھکرانے میں اپنا ذاتی نقصان۔

اور پھر خدا تعالیٰ کی کوئی ذات برادری نہیں، اس کا کوئی خاندان اور قبیلہ نہیں، اس کا وجود کسی خطۂ زمین میں محدود نہیں، وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہر ایک کو دیکھتا، اس کی فریاد سنتا اور مدد کرتا ہے۔ اس سے ہر انسان اپنا رشتہ جوڑ سکتا ہے۔ سفید فام بھی، سیاہ فام بھی، مزدور بھی، مالک بھی، کسان بھی، تاجر بھی، پڑھنے والا بھی، پڑھانے والا بھی، حاکم بھی اور محکوم بھی۔ سب اس کی نگاہ میں برابر ہیں۔ سب اس کی طرف بڑھ سکتے ہیں اور اس سے قرب اور محبت چاہ سکتے ہیں۔ کوئی شخص نہ تو اپنے حسب و نسب سے اس کے پاس اونچا مقام حاصل کرسکتا ہے اور نہ جاہ و منصب سے۔ اس تک رسائی میں نہ تو بدحالی رکاوٹ بنتی ہے اور نہ خوش حالی معاون و مددگار۔ وہ ہر اس شخص کو آگے بڑھ کر لینے کے لیے تیار ہے جو اس کی طرف بڑھے، خواہ وہ افریقہ کا ہو یا امریکہ کا، انگریزی بولتا ہو یا

عربی۔ عزت و سربلندی اس کے نزدیک اس شخص کے لیے ہے جو اپنے آپ کو اس کی غلامی میں لگا دے، اس کے عذاب سے ڈرے اور اس کی رحمتوں کے لیے تڑپے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾ (الحجرات:۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف ذاتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تا کہ تم پہچانے جاسکو۔ بلاشبہ تم میں سب سے زیادہ بزرگ خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہے۔ اللہ بلاشبہ سب کچھ جانتا اور خبر رکھتا ہے۔

جن لوگوں کے سینے خدا کے خوف سے خالی ہوں اور جو اس کی اطاعت سے انحراف کریں ان کو اس کے عذاب سے نہ تو ان کی شان و شوکت بچا سکتی ہے اور نہ اقتدار و حکومت۔ اس زمین پر کتنی ہی قومیں اور کتنے ہی افراد گزرے ہیں جن کو اپنی قوت و طاقت پر غرّہ تھا، جنھوں نے خدا کی غلامی سے انکار کیا اور زمین پر سرکشی کی روش اختیار کی، جس کے نتیجے میں وہ زمین سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دی گئیں۔ خدا کے پیغمبر بھی اس لیے اس کے مقرب ہوتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ اس کے مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں۔ اگر وہ اس کی اطاعت سے انحراف کریں تو ان کو بھی اس کے عذاب سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ محمد ﷺ خدا کے سب سے زیادہ برگزیدہ بندے تھے، لیکن آپؐ کی زبان سے اعلان کرایا گیا:

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ (الانعام:۱۵)

اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کی زمین پر رہنے والے انسانوں میں اس کے انعام و اکرام کے مستحق وہی ہوں گے جن کے دلوں میں اس کا تقویٰ ہو۔ تقویٰ کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کو خدا سے قریب کردے اور اس کی پکڑ سے محفوظ رکھے۔ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل، زبان و بیان، صنعت و حرفت اور قومیت

و وطنیت کا جو فرق پایا جاتا ہے وہ کسی کی برتری یا فروتری کی دلیل نہیں ہے، بل کہ قدرت کی دوسری بے شمار نشانیوں کی طرح یہ بھی ایک نشانی ہے، جو بتاتی ہے کہ اس کائنات میں حقیقی غلبہ و اقتدار صرف خدا ہی کی ذات کے لیے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے خوب صورت پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بدصورت، جسے چاہتا ہے دولت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس سے محروم کردیتا ہے، جس کو جس خطۂ زمین میں چاہے پیدا کرتا ہے اور جو بولی چاہے سکھاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی چیز کو اپنی برتری یا دوسرے کی کم تری کی دلیل سمجھتا ہے تو وہ قدرت کی ایک بہت بڑی نشانی سے عبرت نہیں حاصل کر رہا ہے۔ وہ اس نگاہ سے محروم ہے جس میں خدا کے دلائل کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ (الروم:۲۰-۲۳)

اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تم انسان کی شکل میں زمین پر پھیل گئے۔ یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ایک ہے کہ اس نے خود تمھارے اندر سے تمھارے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت کے جذبات رکھ دیے۔ بلاشبہ اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ یقیناً اس میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اس کی نشانیوں میں سے تمھارا رات کو سونا اور دن میں اس کے فضل (رزق) کو ڈھونڈنا بھی ہے۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (حقیقت کو) غور سے سنتے ہیں۔

یہ تصور انسانوں کے درمیان سے ہر قسم کی عصبیت کو ختم کرتا اور ان کو ایک وحدت میں تبدیل کرتا ہے۔ اس کو ماننے کے بعد انسان کے اندر عزت اور ذلت کے جھوٹے امتیازات کبھی ابھر نہیں سکتے۔ خدا کی بندگی کا احساس غلام اور آقا، حاکم اور محکوم، شاہ اور رعیت سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔

تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے نام پر خود غرضی اور مفاد پرستی کو فروغ دیا گیا، انھیں گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کیا گیا اور ان کے درمیان نزاع اور کش مکش کے اسباب پیدا کیے گئے۔ اسلام کے سوا دنیا کے ہر نظریہ نے انسان کو انسان کا ہم درد اور غم گسار نہیں بل کہ اس کا حریف اور دشمن بنایا اور انھیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں خاندان اور قبیلے تباہ ہوئے، طبقاتی نزاعات ابھرے اور قومی معرکے وجود میں آئے، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور عصمت دری کے بازار گرم ہوئے۔ ایک داستانِ جور ختم نہیں ہوئی کہ دوسری اس سے بھیانک داستان شروع ہوگئی۔ حد یہ کہ اس ظلم و زیادتی کے لیے بعض اوقات اتنی بات کافی سمجھ لی گئی کہ فلاں شخص کا تعلق فلاں دوسری قوم سے ہے، یا فلاں قوم وہ زبان نہیں بولتی جو ہم بولتے ہیں، یا اس خطۂ زمین سے تعلق نہیں رکھتی جس سے ہم تعلق رکھتے ہیں۔ کسی بھی ملک اور قوم پر حملہ کے لیے جرمنوں نے یہ دلیل کافی سمجھی کہ اس کا تعلق جرمن قوم سے نہیں ہے۔ کوئی ایسا نظریہ آج تک نہیں پیش کیا جا سکا جو ظلم و زیادتی کو ختم کرنے والا ہو، جس کی بنیاد انسانیت کے ہر طبقہ کے ساتھ انصاف پر ہو اور جو انسانوں کو ایک دوسرے کے بھائی کی حیثیت سے سامنے لائے۔ اس کے لیے جب اسلام کی طرف نظر اٹھتی ہے تو پھر کسی دوسری جانب دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔[1]

---

[1] اس موضوع کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا رسالہ 'اسلام اور وحدت بنی آدم' ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ نئی دہلی ۲۵۔ اس کا انگریزی کے علاوہ ہندی اور بعض دوسری علاقائی زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

ظلم اور نا انصافی کا خاتمہ

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی خدائی میں یقین اور اس کی بندگی کے احساس ہی سے استحصال، لوٹ کھسوٹ، نفرت اور عداوت، ظلم اور نا انصافی ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ ایک دوسرے کی خیر خواہی، ہم دردی اور مواسات کے جذبات ابھرتے ہیں۔ کیوں کہ خدا کی بندگی انسان سے دو چیزوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کو اس کی نذر کر دے، اس کی حمد و ثنا کرے، اس کی یادوں میں ڈوب جائے، اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو، اپنا سر جھکا دے اور عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اس کے در پر گر پڑے۔ اس کا نام اصطلاح میں عبادت ہے۔ خدا کی بندگی دوسرا مطالبہ یہ کرتی ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کی اور اپنی تمام محبوب چیزوں کی قربانی پیش کی جائے۔ اس کی عملی صورت خدا کی بندوں کی خدمت ہے۔ خدا کے بندوں کی مدد کرنا خدا کی مدد کرنا ہے۔ ان کے کام آنا خدا کے کام آنا ہے۔ اگر آپ کے روبرو خدا کا کوئی بندہ ہاتھ پھیلائے اور آپ اس کو خالی لوٹا دیں تو گویا آپ نے خدا کے ہاتھ کو خالی لوٹایا۔ کوئی مریض آپ کی مدد کا محتاج ہو، اگر آپ نے اس کی مدد سے انکار کیا تو گویا خدا کی مدد سے انکار کیا۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے بندوں کو خوش کیا جائے۔ آسمان والا اسی وقت راضی ہوگا جب کہ زمین والے راضی ہوں۔ اس حقیقت کو نبی ﷺ نے ایک مکالمہ کی شکل میں انتہائی مؤثر اور دل کش انداز میں بیان فرمایا ہے۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے خطاب کرے گا:

ابنِ آدم! میں بیمار پڑا رہا، لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی۔

انسان عرض کرے گا! میرے رب! تو سارے جہان کا پروردگار، میں تیری عیادت کیسے کرتا؟

خدا فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ مریض ہے؟ لیکن اس کے باوجود تو اس کی مزاج پرسی کے لیے نہیں گیا۔ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے پاتا۔

خدا کہے گا: ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔
انسان عرض کرے گا: مولا! تو رب العالمین، میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا۔ ارشاد ہوگا: کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا، لیکن تو نے اسے نہیں کھلایا۔ کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔
خدا فرمائے گا: ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، لیکن تو نے نہیں دیا۔
انسان جواب دے گا: میرے رب! تو رب العٰلمین، میں تجھے کیسے پانی پلاتا؟
ارشاد ہوگا: تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی طلب کیا تھا، لیکن تو نے اسے پانی دینے سے انکار کردیا، ہاں! اگر تو اس کو پانی پلاتا تو یہاں اس کا اجر پاتا۔ (مسلم)

مواسات کی تعلیم

رسول اللہ ﷺ مکہ کے اندر تیرہ سال اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ آپ کی اس تیرہ سالہ دعوت کا مرکزی عنوان تھا خدا کی بندگی اور بندوں کے ساتھ مواسات اور ہم دردی۔ کیوں کہ یہی دین کی بنیادیں ہیں اور انہی سے باقی تمام تفصیلات نکلتی ہیں۔ جو لوگ آپؐ کی اس دعوت کو قبول کرتے انھیں آپؐ آخرت میں کام یابی کی خوش خبری دیتے اور جو اس سے انکار کرتے ان کو ناکامی کی وعید سناتے۔ ان ہی دو بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے بار بار اور تاکید کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا۔ نماز میں بندہ اپنے جذباتِ عبودیت کو ظاہر کرتا ہے اور زکوٰۃ کے ذریعہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ بندوں کا خیرخواہ اور ہم درد ہے، وہ اپنی کمائی ہوئی پونجی سے ان کی مدد کرسکتا ہے۔ جب

تک یہ دونوں بنیادیں مضبوط نہ ہوں دین قائم نہیں ہوسکتا۔ نماز جب تک زندگی میں اتر نہ جائے انسان کے جذبات و احساسات میں بندگی کی روح نہیں پیدا ہوسکتی۔ اسی طرح جو سینے مواسات کے جذبے سے خالی ہوں ان میں اعلیٰ اخلاقیات کا ابھرنا ممکن نہیں ہے۔ انسانوں کو الفت و محبت کے رشتہ میں جوڑنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر ان میں رحم دلی اور غم خواری کے جذبات نہیں پائے جاسکتے، وہ ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی نہیں کرسکتے اور ان کے اندر عفو و درگزر کی صفت نہیں پیدا ہوسکتی۔ اسلام نے معاشرتی و سماجی ہدایات دینے سے پہلے ایسے افراد تیار کیے جو خدا کے اطاعت گزار اور بندوں کے خیرخواہ تھے۔ جب وہ اس قابل ہوگئے تو ان کے سامنے دین کی تفصیلات پیش کیں اور ان پر عمل کرنا ان کے لیے آسان ہوگیا۔ وہ اہلِ ایمان کی سب سے نمایاں خوبی بیان کرتا ہے کہ "وہ نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں" (المومنون: ۲،۴) قیامت کے دن جہنم میں جانے والے اپنے جرم کا اعتراف ان الفاظ میں کریں گے کہ "ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔" (مدثر: ۴۳،۴۴)
جب تک انسان خدا کا عبادت گزار اور بندوں کا خیرخواہ نہ ہو دین اس کے لیے ایک بارِ گراں ہوگا جسے اٹھا کر وہ زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔

مواسات اور بندگیِ رب میں تعلق

اگر آپ غور کریں گے تو یہ دونوں باتیں ایک ہی نظر آئیں گی۔ خدا کے دربار میں عقیدت و محبت کے ساتھ جھک جانا اور اس کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرنا ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ یہ ایک ہی جذبہ ہے جو عمل میں آتا ہے تو دو مختلف شکلیں اختیار کرلیتا ہے۔ جہاں خدا کی بندگی ہوگی وہاں لازماً خدا کے بندوں کے ساتھ محبت بھی ہوگی، ورنہ سمجھا جائے گا کہ بندگی میں کھوٹ ہے۔
مشرکین نماز پڑھتے تھے، لیکن قرآن نے انھیں وعید سنائی اور کہا کہ وہ نماز کی ایک خود ساختہ شکل پر عمل کرتے ہیں اور روحِ نماز سے غافل ہیں۔ اس کی

دلیل یہ دی کہ ان کے دل محتاجوں اور مسکینوں کے حق میں نرم نہیں پڑتے۔ وہ انھیں دھتکارتے اور دھکا دیتے ہیں۔ ان کی تنگ دلی کا یہ عالم ہے کہ عام استعمال کی چیزیں تک کسی کو نہیں دیتے۔ (سورۃ الماعون)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مسکین کی مدد کو نماز کا ایک لازمی نتیجہ سمجھتا ہے۔ وہ اس کا تصور نہیں کرسکتا کہ ایک چیز ہو اور دوسری چیز نہ ہو۔ کیوں کہ یہ دونوں سوتے ایک ہی چشمے سے پھوٹتے ہیں۔ جو دل خدا کی محبت سے سرشار ہو اس کو بندوں کی مصیبت میں بے قرار ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید خدا کی بندگی اور خدا کے بندوں کے ساتھ مواسات اور خیرخواہی کا ایک ساتھ ذکر کرتا اور انھیں ایک سی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ بالکل ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔ بعض مواقع پر اس نے مواسات اور ہم دردی کو عبادت کا قائم مقام قرار دیا ہے، گویا انسانوں کے ساتھ خیرخواہی کا تعلق ان کے رب سے تعلق کی دلیل ہے۔

روزہ خالص عبادت کی ایک شکل ہے جس میں انسان خدا کے لیے بھوکا پیاسا رہتا اور اپنے جذبات کو کنٹرول کرتا ہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ قرآن مصیبت زدہ انسانوں کی مدد اور بہی خواہی کو اس خالص عبادت کے برابر کردیتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ماں قرار دے اور پھر اس سے رجوع کرنا چاہے تو حکم ہوتا ہے کہ بہ طور کفارہ ایک غلام آزاد کرے، یا مسلسل ساٹھ روزے رکھے، یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ (المجادلۃ: ۲، ۳)

قسم کا کفارہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کپڑا دیا جائے، یا کسی غلام کو آزاد کیا جائے، یا تین دن کے روزے رکھے جائیں۔ (المائدۃ: ۸۹)

جو شخص حج میں تمتع کرنا چاہے اس کے لیے حکم ہے کہ وہ قربانی دے اور اگر قربانی کا جانور نہ ملے تو دس روزے رکھے۔ (البقرۃ: ۱۹۶)

ان احکام میں غلام کو آزاد کرنے، مسکینوں کو کھانا کپڑا دینے اور قربانی کو روزہ کے مساوی حیثیت دی گئی ہے۔

عبادات میں جو نقص رہ جائے اس کی تلافی کی بھی یہ صورت بتائی گئی ہے کہ خدا کے بندوں کے ساتھ خیرخواہی کی جائے۔ حالتِ احرام میں بال منڈوانے کی ممانعت ہے۔ اگر کسی تکلیف کی وجہ سے انسان کو بال منڈوانا پڑے تو حکم ہے کہ روزہ رکھے، یا قربانی دے، یا صدقہ کرے۔ (البقرۃ: ۱۹۶)

رمضان کے روزوں کے بعد صدقۂ فطر رکھا گیا ہے اور اس کی یہ علت بیان کی گئی ہے کہ اس سے روزوں میں جو لغو اور ناپسندیدہ اعمال سرزد ہوجاتے ہیں ان کی تلافی ہوجاتی ہے۔ (ابوداؤد)

اس سے بھی آگے کی بات یہ کہ جو لوگ اپنے بڑھاپے یا مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے کے قابل نہ ہوں ان کو روزہ کے عوض کسی مسکین کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔

خدا کی نعمتوں کا احساس

یہ دلائل اس بات کا ثبوت ہیں کہ عبادت اور مواسات میں گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ عبادت کی روح یہ ہے کہ انسان خدا کی نعمتوں اور احسانات کا تصور کرے اور جذباتِ شکر سے اس کا دل معمور ہوجائے اور وہ بے تابانہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے ڈال دے۔ مواسات کے پیچھے بھی یہی روح کارفرما ہے۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ اسے دیکھنے کو آنکھ، بولنے کو زبان، سوچنے اور سمجھنے کے لیے عقل اور زندگی گزارنے کے لیے سامانِ عیش حاصل ہے اور خدا کے دوسرے بندے ان نعمتوں سے محروم ہیں۔ ان کو زندہ رہنے کے لیے کھانا کپڑا تک نصیب نہیں ہے تو بے اختیار خدا کا شکر بجا لاتا ہے۔ اور اپنی دولت کا ایک حصہ ان کے لیے نکال دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر آج میں خدا کے محتاج بندوں کے کام آؤں تو امید ہے کل قیامت کے دن خدا مجھے احتیاج سے بچائے۔ آج اگر میں کسی بندے کو کپڑا پہناؤں تو توقع ہے کہ کل خدا مجھے برہنگی سے محفوظ رکھے اور اگر کسی بھوکے کو کھانا کھلاؤں تو فقر و فاقے سے نجات دے۔

خدا کی نعمتوں کو پانے کے بعد اگر کسی کے اندر یہ جذبہ نہ ابھرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دل خدا کی نعمتوں کے احساس ہی سے خالی ہے۔ غیر خدا پرستانہ ذہن کی یہی خامی ہے کہ وہ اپنے وجود اور اس کائنات سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اس کو خدا کا عطیہ نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک نعمتوں سے بھری ہوئی یہ وسیع کائنات محض اتفاق کا کرشمہ ہے اور یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے کہ اس کے اپنے وجود میں قوتوں اور صلاحیتوں کا ایک ذخیرہ جمع ہوگیا ہے جس کے ذریعہ وہ اس کائنات سے استفادہ کر رہا ہے۔ یہ تصور انسان کے اندر سے رحم اور محبت کے جذبات کو ختم کرنے والا ہے۔ انسان کو جو کچھ ملا ہے اگر وہ کسی کا دیا ہوا نہیں ہے تو اس میں کسی کا کوئی حصہ بھی نہیں ہوسکتا۔ مشرکانہ ذہن خدا کا تصور تو کرتا ہے، لیکن یہ تصور انتہائی مبہم اور گنجلک ہوتا ہے۔ وہ انسان کو خدا کی نعمتوں کے ادراک کا حقیقی شعور نہیں عطا کرتا۔ قرآن مجید انسان کے اندر یہ تصور ابھارتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ تمھیں ملا ہے وہ خدا کی طرف سے ملا ہے، اس لیے از خود اس کے بندوں کا حق اس میں واجب ہوگیا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ۙ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۙ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۭ (البلد: ۸-۱۶)

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور اس کو (حق و باطل کی) دونوں راہیں نہیں دکھائیں؟ لیکن وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا۔ تم جانتے ہو یہ گھاٹی کیا ہے؟ گردن کا چھڑانا (غلام آزاد کرنا) یا فقرو فاقہ کے دن کھانا کھلانا، قرابت والے یتیم کو یا بدحال مسکین کو۔

نعمتوں کو خدا کی طرف سے سمجھنا احساسِ شکر پیدا کرتا ہے اور انسان کو دوسروں کا مخلص اور خیر خواہ بناتا ہے۔ دوسروں کو دیتے ہوئے اس کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ وہ ان پر احسان کر رہا ہے، بل کہ خدا کے فضل و کرم کا احساس اس کے اندر جاگ اٹھتا ہے۔ وہ

وہ سوچتا ہے کہ آج جو نعمتیں مجھے حاصل ہیں ان کے حاصل کرنے میں میری سعی و محنت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ان سے میں محروم بھی ہوسکتا تھا اور یہ مجھ سے چھن بھی سکتی ہیں۔ یہ احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ جو نعمتیں اسے ملی ہیں ان پر سانپ کی طرح قبضہ نہ جمائے رہے، بل کہ ان کو خدا کا عطیہ سمجھ کر اس کی راہ میں صرف کرے۔

اسلام کے نزدیک اسی جذبے کی اصل قدر و قیمت ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہو تو آدمی ہزار خرچ کرے، اسلام اس کو لاحاصل سمجھتا ہے، جیسے کوئی شخص کسی گرد آلود چٹان پر اس امید پر دانے بکھیر دے کہ اس سے کھیتی ہوگی۔

اس جذبے کو ابھارنے کے ساتھ اسلام نے تعین کے ساتھ بتایا ہے کہ عدل و انصاف کے اصول کیا ہیں اور ظلم کی سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ اپنے جیسے دوسرے افراد کے ساتھ کن بنیادوں پر معاملہ کرنا چاہیے اور وہ کون سے طریقے ہیں جو ان کے معاملات کو غلط اور باطل بنا دیتے ہیں؟ اس تعین کے بعد فرد اور سماج دونوں کے لیے آسان ہوجاتا ہے کہ وہ اس کسوٹی پر انسان کے معاملات کا جائزہ لے سکے اور ان میں جو غلطی ہو اس کی اصلاح کرے۔

جو تعلقات خدا پر یقین اور اس کی ہدایت کی بنیاد پر وجود میں آئیں اور جو تعلقات کسی دوسرے عامل کے نتیجے میں پیدا ہوں، ان دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ پہلی قسم کے تعلقات اس وقت تک ٹوٹ نہیں سکتے جب تک کہ خدا کا حکم ان کو نہ توڑ دے، لیکن دوسری قسم کے تعلقات ہر لمحہ پارہ پارہ ہوسکتے ہیں۔ خدا پر یقین رکھنے والا انسان ان تمام تعلقات کو نباہنے پر مجبور ہے۔ جن کے نباہنے کا خدا نے حکم دیا ہے، خواہ اس کا جی چاہے یا نہ چاہے، خواہ اس کے ساتھ ظلم ہو یا انصاف، لیکن جس شخص کو خدا پر یقین نہ ہو وہ ہر اس تعلق کو توڑ سکتا ہے جس میں اس کا نقصان ہو اور اگر اس کا فائدہ ہو تو اپنے قریب ترین عزیز کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ جواب دہی کے

خوف سے خالی ہوتا ہے، اس لیے اس سے ہر قسم کی غداری اور بے وفائی متوقع ہے، لیکن ایک مومن اپنے دشمن کے ساتھ بھی دھوکا اور بے وفائی نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اس کا خدا اس کو اس سے روکتا ہے۔

مواسات کا آغاز

جب انسان مواسات اور غم خواری کے جذبات کے ساتھ عمل کے میدان میں آتا ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلے بیوی، بچے، ماں باپ، بھائی بہن، ہم سایہ اور رشتہ دار آتے ہیں، کیوں کہ انہی سے شب و روز اس کو سابقہ پڑتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہی قریبی افراد سب سے زیادہ انسان کے حسنِ سلوک اور خدمت کے مستحق بھی ہیں۔ ان کو چھوڑ کر دوسروں پر وہ خرچ نہیں کرسکتا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے، اس کا مصرف کیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: اسے اپنی ذات پر صرف کرو اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار بھی ہے۔ آپؐ نے کہا: اسے اپنی اولاد پر صرف کرو۔ اس نے کہا: میرے پاس ایک تیسرا دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس کو بیوی پر خرچ کرو۔ اس نے کہا: میرے پاس چوتھا دینار بھی ہے۔ آپؐ نے کہا: یہ تمھارے غلام کا حصہ ہے۔ اس نے کہا: میرے پاس مزید ایک دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس کا مصرف اب تم خود سمجھ سکتے ہو۔ (ابو داؤد، نسائی)

انسان کو حسنِ سلوک اور خیرخواہی کا آغاز اپنے قریب ترین افراد سے کرنا چاہیے۔ یہ ایک فطری بات ہے، کیوں کہ انسان ان افراد کی مدد کرنے میں کوئی بار محسوس نہیں کرتا جو اس سے قریب ہوں، بل کہ وہ اپنے اندر اس کی تحریک پاتا ہے۔ اسلام نے اس فطری جذبے کو قانونی حیثیت دے دی، تاکہ ہر آدمی ہر حال میں اس کا پابند رہے۔ انسان جس چیز کا مالک ہے اس کے سب سے زیادہ مستحق وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اس کے ارد گرد رہتے اور اس کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر کسی کا باپ بھوکا

مر رہا ہو تو اس کے لیے صحیح نہ ہوگا کہ وہ اپنی دولت ان لوگوں پر صرف کرے جن سے اس کا رشتہ صرف انسان ہونے کا ہے۔ اس کا باپ اس سے انسانیت کا بھی رشتہ رکھتا ہے اور رحمی رشتہ بھی۔ اس لیے وہ اس کے حسنِ سلوک کا دوہرا استحقاق رکھتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

> ”کسی حاجت مند پر صدقہ محض صدقہ ہے، لیکن کسی عزیز پر صدقہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔“ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

مطلب یہ کہ رشتہ دار کے ساتھ حسنِ سلوک کا ثواب دوگنا ملے گا۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ معاشرے کا کوئی بھی فرد اپنے آپ کو بے بس، لاچار اور بے سہارا نہیں محسوس کرسکتا، کیوں کہ معاون و مددگار افراد کا ایک حلقہ اس کے ارد گرد ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ باپ بیٹے کا مددگار اور بیٹا باپ کا مددگار، بھائی بھائی کا معاون، ایک رشتے دار دوسرے رشتہ دار کا حق پہچاننے والا۔ یہ یقین آدمی کے اندر زبردست توانائی اور قوت پیدا کرتا ہے۔

مواسات کی وسعت

مواسات کے لیے ہر شخص کے اطراف کسی دائرے کے کھینچ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس دائرے سے باہر مواسات کی کوئی قدر و قیمت نہیں، یا اسلام اس کو غلط سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی دولت و ثروت سے وہ لوگ محروم نہ رہیں جو اس کے قریب ہیں۔ یہ محض تقدیم و تاخیر کا سوال ہے، ورنہ اسلام اسے کسی انسانی سوسائٹی کی توہین قرار دیتا ہے کہ اس کے کچھ افراد بھوکے اور ننگے مر رہے ہوں اور کچھ عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہوں وہ انسانیت کی بنیاد پر سارے سماج کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کی تعلیم ہے کہ دوست، دشمن، اپنا، پرایا، اجنبی، غیر اجنبی، ہم وطن اور دوسرے وطن والے کے فرق کے بغیر حسنِ سلوک کیا جائے۔ اس کے نزدیک انسان بہ حیثیت انسان ایک قابل قدر سرمایہ ہے۔ وہ کسی صورت سے اس کے ضائع ہونے کو

پسند نہیں کرتا۔ اس لیے وہ ہر شخص کا فرض سمجھتا ہے کہ دوسرے شخص کو مصیبت اور پریشانی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے، ورنہ زمین پر خدا کی ایک نعمت کو وہ ضائع کرنے کا مجرم ہوگا۔[1]

ظلم ہمیشہ اقتدار اور حکومت کے ساتھ رہا ہے، جہاں انسان کو اقتدار ملا اس نے اپنے آپ کو قادر مطلق سمجھ لیا اور جس زیردست کو پایا بھیڑ بکری کی طرح ذبح کرنا شروع کر دیا۔ اس زیادتی کا نشانہ عموماً تین طبقے رہے ہیں: عورت، غلام اور رعیت۔ ان تینوں طبقات کے ساتھ غلامی اور محکومی کا تصور چپک گیا تھا اور عدل و انصاف تو گویا ان کا حق تھا ہی نہیں۔ عورت کی ساری داستان، مظلومیت کی داستان ہے۔ ظلم کا وہ کون سا تیر ہے جو اس پر آزمایا نہیں گیا۔ اسلام نے عورت کو مرد کا ایک جزء بتایا۔ اس طرح اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ عورت پر مرد کی طرف سے جو زیادتی ہوتی ہے، وہ خود اس کے اپنے وجود پر زیادتی ہے۔ ظالم مرد عورت پر ظلم نہیں کرتا بل کہ اپنے آپ پر کرتا ہے۔ غلامی کے آثار آج تک بعض متمدن ممالک میں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اس کے ماضی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلام نے غلام اور آقا کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی کا رشتہ قائم کیا اور آقا کو حکم دیا کہ جو تم کھاؤ وہی اپنے غلام کو بھی کھلاؤ اور جو تم پہنو وہی اپنے غلام کو بھی پہناؤ۔ شاہ اور رعیت کا تعلق بھی غلام اور آقا کے تعلق سے مختلف نہیں تھا۔ انسانوں کے ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کو اپنی خدمت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسلام نے شاہ اور رعیت کے اس تصور کو ختم کیا۔ اور بتایا کہ حکومت خدمت کا دوسرا نام ہے اور جو حاکم ہے وہ اپنی رعایا کا خادم ہے نہ کہ آقا۔[2]

---

[1] اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر راقم نے اپنی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ طبع سوم ۲۰۰۷ء۔ ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ نئی دہلی ۲۵۔ یہاں اس سلسلے کے صرف اشارات کیے گئے ہیں۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف:

'اسلام۔ انسانی حقوق کا پاسبان' طبع سوم
'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' } ناشر، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵

خدا کا قانون

قانون ساز خدا ہے

سوسائٹی میں جو قوت افراد پر حکم رانی کرتی ہے وہ قانون ہے۔ قانون افراد کی آزادی کو کنٹرول کرتا اور ان کے حدودِ عمل کو متعین کرتا ہے۔ اسلام میں جائز قانون صرف خدا کا ہے۔ کسی کام کا حکم دینے یا اس سے روکنے کا حق تنہا خدا کی ذات کو حاصل ہے، کیوں کہ اس کائنات میں اقتدار اور غلبہ اسی کا ہے۔ تمام انسان برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی کسی پر تفوق اور برتری نہیں رکھتا۔ اگر کوئی یہاں اپنا اقتدار چلانا چاہے تو گویا وہ خدا کے حق کو چیلنج کرتا ہے اور جو شخص کسی کے حکم کے آگے جھکتا ہے، وہ اپنی موت اور ذلت کا اعلان کرتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں صرف خدا کا حکم قانون ہے۔ کسی شاہ کا فرمان، کسی گروہ اور جماعت کا فیصلہ یا کسی قوم کی روایات کو قانون کا درجہ حاصل نہیں ہے، اس لیے اسلام قانون کے ان تمام طریقوں کو غلط اور باطل سمجھتا ہے جو انسانوں نے بہ ذاتِ خود اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ کسی کو یہ مقام دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو خدا کی اطاعت کی جگہ اپنی غلامی کی دعوت دے۔

اسلامی قانون کی ہمہ گیری

خدا کو قانون ساز ماننے کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ قانون کو صرف اجتماعی زندگی تک

محدود نہ رکھا جائے، بل کہ انفرادی زندگی میں بھی خدا کے قانون کی حکم رانی تسلیم کی جائے، کیوں کہ خدا سے انسان کا تعلق بازار اور عدالت ہی میں نہیں ہوتا، بل کہ اوّلاً وہ بہ حیثیت فرد کے اس سے رشتہ جوڑتا ہے۔ وہ خدا کو پہلے اپنے جذبات و احساسات میں پاتا ہے۔ پھر سیاسی و سماجی میدان میں اس کو ڈھونڈتا ہے۔ اگر وہ خدا کو اپنے جذبات کی دنیا میں نہ پاسکے تو زندگی کی سرگرمیوں میں وہ اس کو مل نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے اسلامی قانون کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اپنے دامن میں انسان کی قلبی کیفیات اور اس کے ظاہری اعمال دونوں کو سمیٹتا ہے۔ وہ ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ انسان خدا کے سامنے اپنے جذباتِ عبودیت کس طرح ظاہر کرے اور اس کی راہ میں قربانی کرنا چاہے تو کن آداب کو ملحوظ رکھے، دوسری طرف عمل کے میدان میں خدا کی اطاعت اور بندگی کا طریقہ سکھاتا ہے۔ اس کی گرفت سے انسان کی زندگی کا کوئی بھی پہلو آزاد نہیں رہنے پاتا۔ وہ اس کے ظاہر اور باطن دونوں پر قبضہ کرتا ہے اور دونوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

انسانی قوانین کا نقص

انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ کسی عمل سے اس وقت بحث کرتے ہیں جب کہ وہ وجود میں آجاتا ہے۔ اس عمل کے پیچھے کارفرما جذبات و محرکات ان کے دائرہ بحث سے خارج ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ انسان کے باطن میں چھپے ہوئے جذبات و محرکات کا ٹھیک ٹھیک پتا لگانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ان تک اس کی رسائی ہوتی ہی نہیں، حالاں کہ انسان کی زندگی میں بنیادی اہمیت اس کے ان ہی محرکات کو حاصل ہے۔ یہی محرکات کسی معاملہ میں فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ ان ہی کے تحت انسان کسی طرف قدم اٹھانے اور اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک شخص راستہ چلتے ہوئے دیکھتا ہے کہ اس کے سامنے جانے والے کا بٹوہ

گر گیا ہے اور وہ اسے ہاتھ میں لے کر دوڑتا ہوا اس تک پہنچتا ہے اور اس کے حوالے کردیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اپنے ساتھی کو غافل پاکر اس کی جیب خالی کرلیتا ہے۔ یہ صرف جذبے کا اختلاف ہے، جو دو مختلف اعمال کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، لیکن قانون کی کم زوری یہ ہے کہ وہ چور کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنانے کے لیے تو تیار رہتا ہے، لیکن اس ناپاک جذبے پر کوئی پابندی نہیں عائد کرتا جو دوسرے کے مال پر قبضہ کرنے کی انسان کو ترغیب دیتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کو کسی قسم کا مادّی نقصان پہنچائے تو قانون اس سے باز پرس کے لیے فوراً موجود ہوتا ہے، لیکن انسان کے سینے میں نفرت و عداوت اور دشمنی و بدخواہی کی جو بھٹی سلگتی رہتی ہے وہ اس سے تعرض نہیں کرتا، حالاں کہ جب تک عداوت کی آگ باقی ہے، اس وقت تک نقصان پہنچانے سے وہ باز نہیں آسکتا۔

انسان خود کو اپنے عمل سے بہت تھوڑا ظاہر کرتا ہے۔ اس کی ہستی کا بڑا حصہ تو وہ ہے جو اس کے باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ باطن میں جب حرکت پیدا ہوتی ہے تو اعضاء یا جوارح بھی حرکت میں آنے لگتے ہیں۔ اسی کا نام عمل ہے۔ اس کے تمام اعمال، اس کے اندرونی جذبات اور محبت و نفرت کے تابع ہوتے ہیں۔ انسان کی اصل حیثیت اس کے اندر کے وجود سے متعین ہوتی ہے، جسے کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اس کا عمل اس کے اسی اندر کے وجود کا ناقص اور ادھورا اظہار ہے۔ انسان دن اور رات میں چند گھنٹے کام کرتا ہے، لیکن اگر وہ مجسم عمل بن جائے اور ہر آن حرکت و عمل میں رہے تب بھی اس کے اندر کے وجود کا مکمل اظہار نہیں ہوسکتا۔

قانون انسان کی پوری زندگی سے بحث نہیں کرتا، بل کہ وہ اپنا دائرۂ بحث انسان کی صرف عملی دنیا تک محدود رکھتا ہے، جب کہ انسان کے اندر حقیقی تبدیلی لانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پوری زندگی کو بدلنے والا قانون بنایا جائے۔ اسلام ایک ایسا ہی قانون ہمیں عطا کرتا ہے۔ اس کی جڑیں انسان کے جذبات و احساسات میں

اتری ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں سارے سماج میں پھیل گئی ہیں۔ وہ پہلے انسان کے اندر کی دنیا پر قبضہ کرتا ہے، پھر باہر کی دنیا میں اسے اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ خدا کو اپنا آقا اور مولانا ماننے سے انسان کے اندر جو احساسِ عبودیت پیدا ہوتا ہے، وہی اس کو بازار کی چہل پہل میں خدا کا غلام بنائے رکھتا ہے۔ اسلامی قانون کا کمال یہ ہے کہ فرد سے سماج میں اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنے سے پہلے اس کی ذات کو پوری طرح اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ وہ انسان کو نکاح، طلاق، حدود، تعزیرات، عدل و انصاف اور امن و امان کے قوانین ہی نہیں دیتا، بل کہ ان کے احترام کا جذبہ پیدا کرتا اور اس کے دل و دماغ کو ان کی پابندی کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت پر عمل کرتا ہے کہ اگر انسان کے باطن پر خدا کے قانون کی حکم رانی قائم ہوجائے تو اس کا ظاہر اس سے آزاد نہیں رہ سکتا اور قانون سے دل و دماغ ہی اگر بغاوت کر رہے ہوں تو یہ بغاوت عمل کی دنیا میں قدم قدم پر ظاہر ہونے لگتی ہے۔ کسی منافق کے لیے اپنے نفاق کا چھپانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اسی لیے جب تک انسان کا اندرون خدا کے کے سامنے جھک نہ جائے اس وقت تک اسلام اس کو قانون کا حقیقی اطاعت گزار نہیں قرار دیتا، خواہ وہ انسانوں کے ساتھ معاملے میں قانونِ اسلامی کا پابند ہی کیوں نہ رہے۔ اس کے نزدیک صرف وہی شخص مسلم ہے جس کے دل کی گہرائیوں میں اسلام اتر چکا ہو، جو عمل کی دنیا میں اس حال میں آئے کہ اس کے جذبات و احساسات خدا کے حکم کے تابع ہو چکے ہوں اور اس کو دیکھ کر دنیا ایک با اصول اور شریف انسان سے زیادہ خدا پرست اور اطاعت شعار بندہ سمجھے۔ وہ عدالت کے ذریعہ خدا کا فیصلہ سنانے سے پہلے خود کو خدا کے فیصلے کا پابند کرچکا ہو۔ وہ کھلے بازار میں خدا کے حکم کی پیروی کرنے سے پہلے تنہائی کے گوشوں میں اس کی اطاعت قبول کرچکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام خدا کی عبادت اور بندگی کو سیاسی و سماجی قوانین سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ خدا کی بندگی انسان کے اندر زندگی کے تمام معاملات

میں اس کی اطاعت کا شعوری احساس پیدا کرتی ہے اور انسان عقیدہ و عمل کے تضاد سے پاک ہوجاتا ہے۔ اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی اس طرح ہم رنگ ہوجاتی ہے کہ اس کے ایک رُخ کو دیکھ کر دوسرے رُخ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی قانون اپنے ماننے والوں کی اس طرح شعوری تربیت نہیں کرتا۔

قانون کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں فرق

اسلام انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی، دونوں ہی میں قانون کی حکم رانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ماننے والوں کی طرف سے جس دائرۂ حیات میں بھی قانون شکنی ہوگی ان سے وہ مواخذہ کرے گا۔ جس طرح چوری کرنے پر ان کا ہاتھ کاٹے جائیں گے اور زنا کرنے پر کوڑے لگیں گے، اسی طرح اگر وہ نماز چھوڑ دیں تو ان کو قید و بند کے حوالے کیا جائے گا۔ وہ خواہ اجتماعی زندگی میں خدا کے حکم سے بغاوت کریں یا انفرادی زندگی میں اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کردیں، دونوں صورتوں میں وہ اسلام کے نزدیک باغی ہیں۔ اس کے قانون میں مرتد کی سزا قتل ہے اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کی سزا بھی قتل۔ کیوں کہ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس کا عقیدہ اور عمل دونوں اسلامی قانون کے تابع ہوں گے اور اگر وہ کسی بھی پہلو سے قانون کی اتباع نہیں کرتا ہے تو اپنے اس اقرار سے منہ موڑتا ہے۔

لیکن جو لوگ اسلام کے حق ہونے پر مطمئن نہ ہوں اسلام ان پر زبردستی اپنے عقائد اور خیالات مسلط نہیں کرتا۔ وہ ان سے اسلامی قانون کے صرف اس حصہ کی پیروی کا مطالبہ کرتا ہے جس کا تعلق ملکی انتظام سے ہے۔ ملکی قوانین کے پابند رہتے ہوئے ان کو ہر قسم کی جدو جہد کا حق ہوگا۔ اسلامی قانون ان کی دوڑ دھوپ پر بندش اس وقت عائد کرے گا جب کہ وہ ان نظریات کو نقصان پہنچانے والی ہو جس پر سوسائٹی قائم ہے،

ورنہ ان کے حقوق کو چیلنج کرنے کا کسی بھی شخص کو اختیار نہ ہوگا۔ ان کو اپنے عقائد چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، ان کی معاشرت میں مداخلت نہیں ہوگی، ان کو تجارت و زراعت اور صنعت وحرفت کی آزادی ہوگی اور ان کو بولنے لکھنے کا حق ہوگا، غرض یہ کہ ان بنیادی انسانی حقوق میں سے، جسے ہر شخص فطری طور پر اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، کسی حق سے ان کو محروم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اسلام ایسے لوگوں پر اپنے نظریات کو نافذ کرنے کی ذمہ داری نہیں ڈالتا، کیوں کہ کسی نظام کو اس کی نظریاتی اساس پر وہی لوگ چلا سکتے ہیں جن کے جذبات و احساسات پر وہ نظام حکم رانی کر رہا ہو۔ جن افراد کے دلوں میں یہ نظام جگہ نہ پاسکے وہ اسے زمین پر کبھی قائم نہیں کرسکتے، البتہ عام ملکی نظم ونسق میں ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔[1]

قانون کی ہمہ گیری پر اعتراض

قانون کی کلیت اور ہمہ گیری کو عموماً پسند نہیں کیا جاتا اور اس کا دائرہ اجتماعی زندگی تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ کسی قانون کی خوبی یہ تصوّر کی جاتی ہے کہ وہ افراد کی زندگیوں میں اسی حد تک مداخلت کرے، جس حد تک امن و امان اور عدل و انصاف کو قائم رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہو۔ لیکن یہ نقطۂ نظر بسا اوقات انسان کو تضادِ فکر وعمل میں مبتلا کردیتا ہے۔ اس کے نظریات اس کے کردار کی ترجمانی نہیں کرتے اور اس کا ظاہر اس کے باطن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس میں دوئی اور نفاق کا مرض پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ ایک خاص رُخ پر سوچتا ہے، لیکن اجتماعی قانون اس کو دوسرے رُخ پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس کے جذبات و احساسات قانون کے حق میں نہیں ہوتے اور اس سے اس کی اتباع کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ قانون اجتماعیت کے لیے جن چیزوں کو مفید

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'اسلام۔ انسانی حقوق کا پاسبان'
ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵

بل کہ ضروری سمجھتا ہے، فرد ان چیزوں کو غیر ضروری اور نقصان دہ تصوّر کرتا ہے۔ اس طرح مختلف مسائل میں فرد کے افکار، قانون کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔ وہ یا تو ایسے کاموں کے کرنے پر مجبور ہوتا ہے جن کے کرنے کا اس کے اندر کوئی داعیہ نہیں ہوتا، یا اپنے اندر ایسے جذبات لیے ہوئے ہوتا ہے جن پر عمل کے لیے کوئی میدان وہ اپنے سامنے نہیں دیکھتا۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ اختلافِ فکر کے باوجود قانون کے احترام کا جذبہ ہر شخص کے اندر موجود ہوتا ہے۔ قانون کی مخالفت کرتے ہوئے اس کا ضمیر انقباض محسوس کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سماج کا مجرم تصور کرنے لگتا ہے، کیوں کہ قانون کو ختم کرنے کے بعد کسی اجتماعی نظم کو باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ قانون ہی وہ زنجیر ہے جو اجتماعیت کی شیرازہ بندی کرتی ہے، اس لیے جب سے انسان نے اجتماعی زندگی کا آغاز کیا اس وقت سے قانون کی ضرورت کا احساس بھی اس کے اندر پایا گیا اور تاریخ کے ساتھ ساتھ یہ احساس مضبوطی سے اپنی جڑیں اس کے دل و دماغ میں اتار چکا ہے۔

لیکن اس تجزیہ میں حقیقت کم اور مبالغہ زیادہ ہے۔ قانون کی حرمت کا احساس انسان کے اندر اتنا قوی نہیں ہے کہ وہ اس کو قانون کی پامالی سے باز رکھ سکے۔ قانون ایک اجتماعی ضرورت ہے اور فرد کو اصلاً اپنے ذاتی مفاد سے دل چسپی ہوتی ہے۔ ذاتی نفع و نقصان ہی کی بنیاد پر عموماً وہ سوچتا اور عمل کرتا ہے۔ اگر اس کے کسی اقدام سے جماعت کو نقصان اور اس کی ذات کو فائدہ پہنچ رہا ہو تو مشکل ہے کہ وہ اس اقدام سے باز آجائے۔ کیوں کہ قانون کے احترام سے سوسائٹی کو جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے اور فرد کا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کو پہنچنے والے نقصان کا اثر بھی عموماً فرد پر بالواسطہ اور بہت کم مقدار میں پڑتا ہے۔ اس لیے جن چیزوں کے نفع وضرر سے فرد بہ راہِ راست متاثر ہو ان کی اہمیت بھی اس کے

نزدیک زیادہ ہوتی ہے۔ اگر اس کے مکان کی ایک اینٹ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اس کو سخت صدمہ ہوگا اور وہ اس کی اصلاح کی فکر کرے گا، لیکن اگر کسی سرکاری عمارت کو آگ لگ جائے تو بھی اس کو کچھ زیادہ افسوس نہ ہوگا۔ کیوں کہ مکان کے ساتھ اس کے ذاتی مفاد کا تصور وابستہ ہے، وہ اس کو گرمی سردی سے بچاتا اور اس کے بیوی بچوں کی حفاظت کرتا ہے، لیکن سرکاری عمارت سے اسے اس طرح کے کسی بہ راہِ راست فائدہ کی توقع نہیں ہوتی۔

اسی مفاد پرستی کا نتیجہ یہ ہے کہ قانون کی ضرورت و اہمیت کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان قانون شکنی کرتا رہتا ہے۔ ایک اسمگلر اپنے ملک کی دولت دوسرے ملک کو اسمگل کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ اس طرح اپنے ملک کو غربت و افلاس میں مبتلا کر رہا ہے، بل کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اس سے میری بچی کی شادی دھوم دھام سے ہوگی اور میرے مکان کی چوتھی منزل مکمل ہوجائے گی۔ اسی طرح ایک کلرک رشوت کے چند پیسے اس لیے قبول کرتا ہے کہ اس سے ایک عمدہ جوڑا تیار ہوجائے گا۔ اس کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کا یہ ایک جوڑا لباس حق و انصاف کا خون بہانے کے بعد تیار ہو رہا ہے۔

قانون کے مؤثر اور طاقت ور ہونے کی ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس کے پیچھے رائے عامہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ قانون ہی سوسائٹی میں حقوق کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ قانون کو اگر ختم کر دیا جائے تو ہر ایک کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے قانون شکنی کو بہ حیثیتِ مجموعی کوئی سوسائٹی برداشت نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی شخص بازار کی چیزوں میں ملاوٹ کو پسند نہیں کرتا، اس لیے کہ اس کے بعد وہ خود بھی کسی خالص چیز کی توقع نہیں کر سکتا۔ آدمی اگر اپنے دشمن کے گھر میں چوری کو جائز سمجھتا ہے تو گویا وہ اپنے گھر میں چوری کی دعوت دے رہا ہے۔ کسی ادنیٰ سے ظلم کی ہمت افزائی کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر طرف ظلم و زیادتی کا راستہ کھل جائے۔ اس لیے

فرد کا مفاد اسی میں ہے کہ سوسائٹی قانون کی پابند رہے اور جو شخص قانون کی مخالفت کرنا چاہے اس کو مخالفت کا موقع نہ دیا جائے۔ سوسائٹی کے اس احساس کو ٹھکرا دینا کسی بھی شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رائے عامہ کبھی قانون کو رد نہیں کر سکتی، لیکن یہ بات صرف نظری طور پر حاصل ہوتی ہے۔ عمل کے میدان میں پہلے ہی قدم پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قانون کے پیچھے رائے عامہ موجود ہے اور کون سا قانون عوام کی تائید سے محروم ہے؟ آج تک کوئی ایسا طریقہ نہیں دریافت ہوسکا جس سے پوری قوم کی رائے معلوم کی جاسکے۔ اب تک رائے عامہ کے معلوم کرنے کے جتنے طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ اکثریت کے رجحان کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ اس اکثریت میں بھی عموماً ایک چھوٹی سی تعداد ہی کی مرضی فیصلہ کن ہوتی ہے۔ جس قانون کے بنانے میں پوری قوم کی مرضی شریک نہ ہو اس سے اس قانون کی وفاداری کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔

اس موقع پر کہا یہ جاتا ہے کہ قانون خواہ سب کی مرضی کے مطابق ہو یا نہ ہو، لیکن سب اس کی تائید پر مجبور ہوتے ہیں، اس لیے کہ عدل و انصاف اور امن و امان کے باقی رکھنے کے لیے قانون کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ ایک مفروضہ ہے، کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ قانون شکنی ہر ایک کے حق میں نقصان دہ اور مضر ہی ہو۔ اس سے سوسائٹی کے بعض افراد کو فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ اس لیے مجرم کو قانون شکنی پر سوسائٹی کے کچھ افراد کی ملامت اور لعن طعن کا خدشہ ہوتا ہے تو کچھ دوسرے افراد کی ہمت افزائی اور تائید بھی اسے حاصل ہوتی ہے۔ قانون شکنی پر کسی شخص کی تائید کرنے والے عموماً وہ افراد ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ زندگی گزارتا ہے اور جو ہمیشہ اس سے قریب رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی تائید یا مخالفت کو وہ بہت اہمیت دیتا ہے اور سوسائٹی کے سینکڑوں

افراد کی مخالفت کے مقابلے میں ان چند نفوس کی حمایت اس کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بسا اوقات انسان قانون کی پامالی ان ہی افراد کی ترغیب پر کرتا ہے۔ شاید ایک سرکاری آفیسر رشوت سے اپنا دامن بچائے رکھے اگر اس کے قریب ترین افراد اس کو اپنی اصل آمدنی پر قناعت کرنے کی اجازت دیں اور اس کو ناجائز طریقے سے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے پر مجبور نہ کریں۔

کیا انسانی قانون اپنے مقصد میں کام یاب ہے؟

بات یہیں ختم نہیں ہوتی کہ قانون شکنی کے داعیات خود سوسائٹی میں موجود ہوتے ہیں، بل کہ اصل سوال قانون ہی کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ جس مقصد کے لیے قانون کی پابندی قبول کی جاتی ہے اس کی کیا ضمانت کہ لازماً ہر قانون سے وہ مقصد حاصل ہی ہو۔ ہمارے سامنے قانون سازی کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ کتنے ایسے قوانین بنے جو کالے ناگ کی طرح انسانی حقوق کو نگلتے چلے گئے اور جن کے زہر سے پوری سوسائٹی چیختی اور کراہتی رہی۔ یہ قانون ہی کی کرشمہ سازی تو ہے کہ بیسوائی کو سماجی ضرورت ثابت کر کے انسانوں کو اس کے نتائج بھگتنے پر مجبور کیا جاتا رہا، قومی مفاد کے نام پر لوٹ کھسوٹ کو جائز قرار دیا گیا اور آج بھی ظلم و ناانصافی کا ہر راستہ قانون کے ہی نام پر کھلتا ہے۔ ان میں بہت سے مظالم تو وہ ہیں جن پر کسی ایک فرد یا کسی ایک قوم کی نہیں، بل کہ ساری دنیا کی مہر تصدیق ثبت ہے۔

جب تک قانون سازی کا حق انسانوں کو حاصل ہے قانون ان کی خواہشات سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ وہ یا تو کسی فرد کی خواہش کا کھلونا بنا رہے گا، یا کسی جماعت کی خواہش کا۔ اگر اس میں وسعت پیدا ہوئی تو وہ قوم کی خواہشات کی پیروی کرے گا۔ ایسا کوئی قانون، جس میں سارے انسانوں کی فلاح و بہبود کا سامان ہو، کوئی بھی شخص وضع نہیں

کر سکتا، اس پر ذاتی، قومی اور وطنی مفادات اس قدر چھائے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے بلند ہو کر سوچنا اس کے لیے دشوار ہے۔ اور پھر قانون ایک فرماں روا قوت کی حیثیت سے اسی وقت کام کرسکتا ہے جب کہ انسان کے جذبات اس کے تابع ہو چکے ہوں اور وہ قانون کا اتباع سوسائٹی کے دباؤ سے یا اس تصور سے نہ کرے کہ یہ سماج کی ایک ضرورت ہے، بل کہ وہ عقیدۃً قانون کو اپنے تمام ذاتی، قومی، وطنی اور نسلی مفادات سے بلند تر تسلیم کرے اور تنہائی کے گوشے میں بھی اس کی مخالفت کو صحیح تصور نہ کرے۔

اسلامی قانون کی کام یابی کے اسباب

اسلامی قانون ایک ایسی ہستی کی فرماں روائی کا اعلان ہے جو ان تمام تعصّبات سے پاک ہے جن سے کسی بھی انسان کا سینہ آلودہ ہوسکتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور کبھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے فیصلہ میں کسی کی طرف جھک جائے گا۔ وہ سب سے بلند و برتر ہے اور سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ قانون کے بارے میں یہ تصور کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اس کی عظمت و برتری کا احساس انسان کے اندر پیدا کرتا ہے اور وہ اس کو ایک ایسے فرمان کی حیثیت سے قبول کرتا ہے جس سے اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ قانون کی کام یابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا استقبال ناقابل انکار حکم کی حیثیت سے ہو اور اسے کسی رخ سے چیلنج نہ کیا جاسکتا ہو۔

اسلام انسان کے جذبات کی تربیت اس ڈھنگ پر کرتا ہے کہ وہ اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اس کے دیے ہوئے قانون کی مخالفت کسی حال میں جائز نہیں سمجھتا۔ وہ رات کے سناٹے میں بھی اس کی پابندی اس طرح کرتا ہے جس طرح دن کے اجالے میں کرتا ہے۔ اس کے لیے گوشۂ تنہائی اور بھری محفل دونوں برابر ہوتے ہیں۔ اس پہلو سے قانون کے تمام دفتروں میں قرآن وہ منفرد 'کتابِ قانون' ہے جو

انسان کی زندگی کے لیے صرف قانون ہی نہیں دیتی، بل کہ اس کے جذبات کو بھی قانون کے حق میں سازگار بناتی ہے۔ اس نے قانون کی اتنی تفصیل نہیں پیش کی جتنی تفصیل سے اس نے انسان کی نفسیاتی کم زوریوں کی اصلاح کی۔ زندگی کے کسی بھی مسئلے میں اس نے بہت زیادہ احکام نہیں دیے۔ اس کے بعض احکام و قوانین تو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، لیکن اس نے قانون کی پیروی کا جذبہ ایسا ابھارا کہ انسان از خود قانون کی روح اور مقصد ڈھونڈنے لگا۔ آج مسلمانوں کے پاس قانون کا اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ اس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور یہ سرمایہ زیادہ تر تلاش اور جستجو کا نتیجہ ہے کہ قانون کا منشا و مقصد کیا ہے اور کس طرح زندگی کو اس کے تابع بنایا جاسکتا ہے؟ یہ تلاش اور جستجو اتنے پاک جذبات اور اس قدر اخلاص اور محنت کے ساتھ ہوئی ہے کہ قانون کی تمام تفصیلات اگر بیان کر بھی دی جاتیں تو شاید اپنے مقصد کے لحاظ سے اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتیں۔ یہ سب کچھ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ قانون ایک بالاتر قوت ہے اور اپنے آپ کو اس کے تابع کر دینا ہے۔ اگر یہ احساس دل کے اندر سے نہ ابھرے تو انسان ہر زنجیر توڑ سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قانون کی سختی یا معاشرے کے دباؤ کا انسان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یقیناً ان دونوں چیزوں میں بڑی قوت ہے، لیکن یہ کسی کو قانون کا پابند نہیں بنا سکتیں، البتہ غلط روی سے روکنے میں مدد و معاون ہوتی ہیں۔ اس لیے قانون کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان معاون قوتوں سے بھی فائدہ اٹھائے۔ مجرم کو اس کے جرم کی ایسی سزا دے کہ کسی دوسرے کو اس کے ارتکاب کی ہمت نہ ہو۔ اگر قانون میں اتنی سختی نہ ہو تو عدل و انصاف اور امن و امان کا قائم رہنا دشوار ہے۔ اسلام جہاں انسان کو قانون کی پیروی پر آمادہ کرتا ہے، وہیں اس نے قانون کو بھی اتنا سخت رکھا ہے کہ محض اس کی سختی ہی قانون شکنی سے باز رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

لیکن اسلام ہر معاملے میں قانون کی شدت کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک سختی آخری نسخہ ہے، جس کا استعمال اس وقت ہونا چاہیے جب کہ مجرم کی اصلاح کی اور کوئی صورت نہ ہو اور اس سے سوسائٹی پر غلط اثرات پڑ رہے ہوں۔

اسلام تین صورتوں میں قانون کی سختی کو روا رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ دعویٰ ایمان کے بعد کوئی شخص اس سے منحرف ہوجائے۔ اس لیے کہ سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے ان کے حق ہونے کی شہادت دے کر پھر ان کے غلط اور باطل ہونے کا اعلان کرنا اس کو کم زور کرنا ہے۔ دوسری صورت یہ کہ ملکی انتظام سے بغاوت کی جائے۔ تیسری صورت یہ کہ انسانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کی جائے۔ ان میں سے جو بھی صورت پیدا ہو اسلام قانون میں شدت کو پسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زانی کو معاف کرنا یا باغی کو بغاوت کی مہلت دینا خود ایک اجتماعی جرم ہے۔ اسی طرح وہ سوسائٹی کے دباؤ سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ چناں چہ اس نے حدود اور تعزیرات کے لیے ضروری سمجھا ہے کہ ان کا نفاذ برملا اور بھرے مجمع میں ہو، تاکہ سزا کے ساتھ مجرم کی اخلاقی کم زوری سامنے آئے اور معاشرہ کے اندر یہ احساس باقی رہے کہ جرم ہمت افزائی کے لیے نہیں ہے، بل کہ وہ اس قابل ہے کہ ہر طرف سے اس کی ہمت شکنی ہو۔ اس کے ساتھ اسلام نے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حفاظت اور سوسائٹی کے بقا و تحفظ کی ذمہ داری کسی ایک دو فرد پر نہیں، بل کہ تمام افراد پر ڈالی ہے۔ اسلام کو اگر کوئی صدمہ پہنچے اور اس کو بچانے کی کوشش نہ ہو تو پوری سوسائٹی مجرم قرار پائے گی۔ ہر مسلمان اسلام کا محافظ ہے اور اس پر ہونے والے حملے کی روک تھام اس کا فرض ہے۔

قرآن کے بعض قوانین

اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں ان کی وضاحت کے لیے ہم قرآن سے اس کے

بعض قوانین پیش کرتے ہیں۔ ہر انسان کی جان محترم ہے۔ اس کو گزند پہنچانے، یا اس پر دست درازی کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس سلسلہ کا اصول یہ ہے کہ انسان کے جسم و جان کے ساتھ جس قسم کی بھی چھوٹی یا بڑی زیادتی ہوگی اسی طرح کا بدلہ لیا جائے گا۔ ارشاد ہے:

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدۃ:۴۵)

تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ فرض کیا تھا (یہی حکم اس امت کے لیے بھی ہے) کہ جان کی بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح دوسرے زخموں کے لیے بھی برابر کا بدلہ ہے۔ پھر جو اسے معاف کردے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

جان کے بعد مال کی اہمیت ہے۔ اسلام نے اس کے تحفظ کو یقینی بنایا ہے۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ جو شخص چوری کرے، اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (المائدۃ:۳۸)

چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کے ہاتھ ان کے عمل کے بدلہ میں کاٹ دو۔ یہ اللہ کی جانب سے ان کی عبرت ناک سزا ہے۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔

اسلام معاشرے میں جن اعلیٰ اخلاقی اقدار کو فروغ دینا چاہتا ہے ان میں عفت و عصمت کو بنیادی اہمیت ہے، اس لیے اس نے زنا اور بدکاری کو بدترین جرم قرار دیا ہے اور اس پر سخت سزا رکھی ہے۔ ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور:۲)

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور اللہ کا قانون نافذ کرتے ہوئے تمھیں ان پر رحم نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ضروری ہے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو۔

اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں ہر شخص کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور اس پر کسی طرف سے حملہ نہ ہو۔ اس لیے اس نے حکم دیا:

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور:۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ پیش کریں تو تم ان کو اسی کوڑے لگاؤ اور کبھی ان کی گواہی نہ قبول کرو۔ کیوں کہ یہ لوگ فاسق ہیں۔

حکومت سے بغاوت اور فساد فی الارض جتنا بھیانک جرم ہے اس کی سزا بھی اتنی ہی شدید رکھی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (المائدۃ:۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو بری طرح قتل کیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں۔ یہ دنیا میں ان کے لیے رسوائی ہے اور آخرت میں ان کو بڑا عذاب ہوگا۔ اس سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو توبہ کرلیں، قبل اس کے کہ تم ان پر قدرت پالو۔ پس جان لو کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

ان آیات میں آپ دیکھیں گے کہ قانون کو محض سماجی بندش کی حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا ہے، بل کہ وہ ایک ایسی ہستی کا حکم ہے جس کی گرفت سے انسان کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ ان میں ایک طرف قانون کی خلاف ورزی پر سخت ترین سزائیں تجویز کی گئی ہیں اور دوسری طرف آخرت کے تصور کی مدد سے ان کی اطاعت پر ابھارا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ قوانین ان تمام افراد کو خطاب کرکے دیے گئے ہیں جو ان کے حق ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، تاکہ پوری سوسائٹی میں ان کے نفاذ کا احساس بیدار رہے اور ہر فرد یہ تصور کرے کہ قانون شکنی کی روک تھام اس کا اپنا فریضہ ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔

اسلام — ایک ابدی نظام

اسلام کا ماضی اور مستقبل

کبھی کبھی آپ اسلام کے بارے میں اس قسم کے تبصرے سنیں گے کہ "اسلام چودہ سو سال قبل کا نظام ہے، اب اس کا اعادہ ممکن نہیں"۔ اس طرح کے جملے مخصوص ذہنیت کے ترجمان ہیں۔ ان میں ایک طرف اسلامی نظام کا ماضی کے ایک واقعہ کی حیثیت سے اعتراف ہے اور دوسری طرف مستقبل میں اس کی جانب سے مایوسی کا اظہار ہے، حالاں کہ جو واقعہ ماضی میں ایک مرتبہ وجود میں آچکا دوبارہ اس کے پیش آنے کا امکان کسی بھی ایسے واقعہ کے مقابلہ میں زیادہ ہے جو اب تک صرف عالمِ خیال میں ہو۔ کیوں کہ ماضی ہمیں یقین فراہم کرتا ہے اور مستقبل کے بارے میں صرف قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ماضی کسی واقعہ کی دلیل ہوتا ہے، جب کہ مستقبل امکان سے بحث کرتا ہے۔ ہم کسی امکان کو تو رد کرسکتے ہیں، لیکن کسی واقعہ کی تردید نہیں کرسکتے۔ اس لحاظ سے اسلامی نظام کے اعادے کے امکانات قوی تر ہوجاتے ہیں، کیوں کہ وہ ماضی کا ایک ایسا قطعی اور نمایاں واقعہ ہے کہ تاریخ میں اس سے زیادہ نمایاں اور ابھرا ہوا کوئی دوسرا واقعہ نہیں پایا جاتا۔ اگر کوئی طالبِ علم تاریخ کے صفحات کھولے تو شاید اس کی نظر سب سے پہلے اسی واقعہ پر جمے گی۔ ماضی کا یہ واقعہ مستقبل میں اپنے ظہور کا اعلان ہے۔

واقعات تاریخ کے تابع نہیں ہوتے

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کا کوئی مستقبل نہیں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ ہر واقعہ کچھ خاص تاریخی اسباب و حالات کے تحت وجود میں آتا ہے، اگر یہ حالات نہ ہوں تو وہ واقعہ بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ اور حالات کسی کی مرضی کے پابند نہیں ہوتے، بل کہ وہ اپنی طبعی رفتار سے چلتے ہیں۔ انسان ان پر بالکل قابو نہیں رکھتا۔ اس کے بس میں نہیں ہے کہ حالات جس رُخ پر چل رہے ہوں اس کے خلاف کوئی دوسرا رُخ اپنے لیے متعین کرلے۔ دوسرے الفاظ میں کوئی بھی نظریہ اپنے زور اور قوت سے اس زمین پر قائم نہیں ہوتا، بل کہ خارج کی قوتیں اس کو جنم دیتی ہیں۔ انسان ان قوتوں کا تابع اور آلۂ کار ہے۔ وہ اس سے جس طرح چاہتی ہیں کام لیتی ہیں۔

لیکن یہ تصور حقیقت کے خلاف ہے۔ واقعات تاریخ کی رفتار کے تابع کبھی نہیں ہوتے، بل کہ انسان کا عزم و ارادہ واقعات کو وجود دیتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات جب کوئی واقعہ پیش آنے والا ہوتا ہے تو تاریخ کی رفتار اس کی معاون اور مددگار بن جاتی ہے، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات میں ایک جان دار نظریہ اٹھتا ہے اور اپنی فطری قوت اور صلاحیت کے ذریعہ چھاتا چلا جاتا ہے۔ تاریخ اس کے اقدامات کو دیکھ کر اپنا رخ متعین کرتی ہے اور زمانے کو اس کی خاطر اپنے مانوس اور مسلّمہ اقدار ترک کرنے پڑتے ہیں۔

یہ کہنا ایک جانی پہچانی حقیقت کو جھٹلانا ہے کہ ظلم، نا انصافی، بدامنی اور فساد حالات کے تقاضے کے تحت وجود میں آتے ہیں اور حالات ہی انسانیت کو حق و انصاف سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ شہنشاہیت کے بعد اشتراکیت کا عذاب روس پر مسلط ہوا تو کیا وہاں کے حالات اس کے داعی تھے۔ یا ایک ظلم کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو دوسرے ظلم نے اپنا پنجہ جما لیا؟ آمریت اگر جمہوریت کی جگہ لیتی ہے تو کیا اس کی وجہ جمہوریت کی ناکامی ہوتی ہے، یا شوقِ حکمرانی جمہوریت کے حلق پر چھری پھیرتا ہے؟ واقعات اگر

حالات کے تابع ہوتے تو شاید انسان حق و صداقت سے محروم ہی رہتا۔ کیوں کہ حق کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ ظلم و نا انصافی کے جواب میں ابھرا ہے اور وقت کے حالات کے علی الرغم اس نے کام یابی حاصل کی ہے۔

چودہ سو سال قبل عرب میں اسلام کی دعوت کا اٹھنا اور اس کا اپنے ماحول پر غالب آنا تاریخ کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ یہ دعوت ایک ایسے وقت میں شروع ہوئی جب کہ وقت کے تصوّرات اس سے بری طرح متصادم تھے۔ قدم قدم پر ان کے درمیان جنگ ہوتی رہی، بالآخر وقت کے ان تصورات کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی اور زندگی کا نقشہ پوری طرح اس دعوت سے ہم آہنگ ہوتا چلا گیا۔ اسلامی نظام کی کام یابی اس پہلو سے تاریخ عالم کی واحد مثال ہے کہ حالات اس پر کسی بھی پہلو سے اثر انداز نہیں ہوسکے۔ جب یہ نظام عملی شکل میں قائم ہوا تو اس کے کسی جزء میں ترمیم کی ضرورت نہ پڑی۔ سوشلزم آج دنیا کا ایک محبوب نظریہ رہا ہے۔ جس ملک نے بھی اس کو اپنایا ہے اپنے حالات کے تحت اس کو مسخ کر کے اپنایا، لیکن اسلامی نظام جب قائم ہوا تو ٹھیک اسی شکل میں قائم ہوا جس شکل میں محمد ﷺ نے اس کو پیش کیا تھا۔ دنیا کے ہر نظام میں نظریہ اور عمل کا جو تضاد ہمیں ملتا ہے اسلامی نظام میں یہ تضاد مفقود تھا۔

ماضی میں اسلام کا اس طرح مکمل غلبہ اس بات کی دلیل ہے کہ آج بھی وہ غالب ہوسکتا ہے۔ حالات نہ تو اس کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے اور نہ ان سے اس کو مصالحت کرنی پڑے گی۔

حالات انسان پر حکم رانی نہیں کرتے، بل کہ وہ اس کے طرزِ فکر کے ترجمان ہوتے ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کس قسم کی معاشرت اور تہذیب کو پسند کرتا ہے اور اخلاق اور قانون کے بارے میں اس کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ اگر کوئی طاقت ور نظریہ انسان کے طرزِ فکر میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے تو یقیناً حالات بھی بدل سکتے ہیں۔ یہاں تصادم اور ٹکراؤ اصلاً نظریہ اور حالات کے درمیان نہیں ہوتا، بل کہ ایک نظریہ اور

دوسرے نظریہ کے درمیان ہوتا ہے۔ جو نظریہ طاقت ور اور غالب ہوتا ہے، حالات اس کی پیروی کرتے ہیں، وہ جس رخ پر چلتا ہے حالات کا دھارا بھی اسی رخ پر بہنے لگتا ہے۔

موجودہ دور خالص مادیّت کا دور ہے۔ اس نے انسان کے چاروں طرف مادیّت کا ایک ایسا جال بچھا رکھا ہے کہ اس کے لیے اس جال سے باہر قدم نکالنا دشوار ہوگیا ہے۔ تہذیب، تمدن، معاشرت، تعلیم، صنعت، تجارت ہر چیز پر مادی تصوّرات چھائے ہوئے ہیں۔ آدمی مادّی تصوّرات کے تحت سوچتا اور مادّی اقدار سے ہر چیز کو ناپتا ہے۔ لیکن ہمارا یقین ہے کہ اس کے مقابلے میں خدا پرستی اور آخرت طلبی کا تصوّر صحیح ڈھنگ سے پیش کیا جائے تو حالات میں انقلاب آسکتا ہے اور مادیّت کے بنائے ہوئے سارے سانچے ٹوٹ سکتے ہیں۔ حالات اگر مادیّت کی راہ میں حائل نہیں ہوئے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ طلبِ آخرت کی راہ میں حائل ہوں۔ جس طرح آج انسان اپنے مادّہ پرستانہ ذہن کی وجہ سے مجبور ہے کہ بھلے یا برے ہر طریقے سے دنیا کا عیش حاصل کرے، بالکل اسی طرح آخرت کی فکر اس کو مجبور کرے گی کہ وہ آنے والے فائدے کی خاطر موجودہ راحت کو قربان کرے۔

حق ہو یا باطل، جھوٹ ہو یا سچ، ظلم ہو یا انصاف ان کا ظہور ہر حال میں اور ہر دور میں ہوسکتا ہے۔ حالات کے اختلاف سے ان کی شکلیں تو بدلتی رہتی ہیں، لیکن حقیقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چوری ہندستان اور امریکہ دونوں جگہ ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک چور جو ہندستان میں نقب زنی کرتا ہے شاید امریکہ کے بدلے ہوئے حالات میں موٹر کار کی چوری کو مناسب سمجھے۔ آج جو شخص اپنے کاروبار میں مکروفریب کو جائز سمجھتا ہے اگر وہ سو سال پہلے پیدا ہوتا تب بھی اپنے کاروبار کو اس سے پاک نہ رکھتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مکروفریب کی جن تدبیروں سے وہ اس وقت کام لے رہا ہے، ایک صدی پہلے اس کی تدبیریں ان سے مختلف رہی ہوں گی۔ دشمن کی مدافعت ماضی میں بھی ہوتی تھی اور موجودہ دور میں بھی ہوتی ہے، اتنے فرق کے ساتھ کہ ماضی میں انسان اپنے دشمن پر پتھر اور نیزہ سے حملہ کرتا تھا اور آج بم برساتا ہے۔

انسان کی فطرت اٹل ہے

انسان اس زمین پر جب سے آباد ہے اس کے تہذیبی و تمدنی، سیاسی و جغرافیائی حالات میں ہزارہا انقلابات آئے، لیکن اس کے جذبات و احساسات نے کوئی تغیر نہیں قبول کیا۔ وہ جس دور میں بالکل سادہ اور غیر متمدن زندگی گزار رہا تھا، نہ تو اس وقت اچھائی اور برائی کے احساس سے خالی تھا اور نہ اب، جب کہ اس پر تکلف اور تصنع کے پردے پڑے ہوئے ہیں، اس کا یہ احساس چھپ گیا ہے۔ موجودہ زمانے کی پھیلی ہوئی ضروریات کی تکمیل کے لیے آج جس طرح وہ ظلم و زیادتی کی راہ اختیار کرتا ہے اسی طرح ماضی میں اپنی محدود ضروریات کے باوجود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔ ماضی میں اگر وہ رحم دلی، محبت اور عدل و انصاف کے تصور سے واقف تھا تو اب بھی وہ اس سے نا آشنا نہیں ہے، اس لیے یہ سمجھنا انتہائی نادانی ہے کہ جس نظریے کا کسی نسبتاً غیر متمدن دور میں تجربہ ہوا اب تمدن کی رنگینیوں میں اس کا اعادہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ سوال اس وقت اٹھتا جب کہ موجودہ متمدن انسان ماضی کے غیر متمدن انسان سے جذبات و احساسات میں مختلف ہوتا، حالاں کہ اس زمین پر پہلا انسان جو وجود میں آیا اس کے اور آج کے انسان کے درمیان اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ماضی کے کسی نظریے کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ انسان کے جذبات پر حکم رانی کر سکے تو حالات کا کوئی بھی تغیر اس کو مستقبل میں فرماں روائی سے نہیں روک سکتا اور جدید ترین کوئی بھی نظریہ فنا ہوسکتا ہے اگر اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے۔

وقتی نظریات

وقت کے ساتھ ساتھ جو نظریات ختم ہوجاتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ یا تو کچھ ہنگامی مسائل نے ان کو جنم دیا ہو یا ان کا تعلق کسی مخصوص طبقے اور گروہ سے ہو۔ جو انجمن اس مقصد سے وجود میں آئی ہو کہ اسے نوجوانوں کو تعلیم کی سہولت بہم پہنچانی ہے،

اس انجمن کو اس وقت زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رہتا جب کہ حصولِ تعلیم کی آسانیاں موجود ہوں۔ اگر کوئی اخلاق سدھار کمیٹی بنتی ہے تو وہ اس وقت تک کام کرسکتی ہے جب تک کہ اسے وعظ و تبلیغ کے مواقع حاصل ہوں اور لوگوں کی اصلاح و تربیت اس کے لیے ممکن ہو۔ اسی طرح جو پروگرام کسی مخصوص قوم یا ذات برادری کے لیے عمل میں آیا ہو، اس قوم کے ساتھ وہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ بعد میں وہ تاریخ کی زینت تو بن سکتا ہے، لیکن اس کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو نظریہ کسی قوم، نسل یا وطن کی بنیاد پر ابھرتا ہے، اس کے پیشِ نظر اس قوم اور اس وطن کے مخصوص حالات و مسائل ہوتے ہیں۔ اس کو کسی دوسری قوم کے مفاد سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ کسی خاص فرقے کے مفاد میں بننے والے پروگرام میں کسی دوسری جماعت کی فلاح کی راہیں تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی تنگ گلی میں جس میں بیک وقت ایک ہی گاڑی گزر سکتی ہو مزید گاڑیاں گزارنے کی کوشش کی جائے۔

اس طرح کے نظریات کے ابھرنے کے لیے ہر نئے سیاسی و سماجی تغیر میں مواد موجود ہوتا ہے، اس لیے وہ بار بار انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان میں وقتی کشش ہوتی ہے، اس لیے انسان ان کی طرف تیزی سے بڑھتا بھی ہے۔ کبھی تو ان میں اس کے قومی جذبے کی آسودگی کا سامان ہوتا ہے، کبھی ان سے اس کے وطنی رجحانات کو تقویت ملتی ہے اور کبھی وہ اس کے اندر ابھرنے والے جذباتِ خیر کی تسکین کرتے ہیں، لیکن ان ہنگامی نظریات سے دو بڑے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ پہلا نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کی فکر و نظر میں محدودیت پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان کی یہ بہت بڑی کم زوری ہے کہ وہ اپنے مخصوص مسائل و حالات کے تحت اپنے ذہن میں جو تصوّر قائم کرتا ہے، حقیقت کو بھی اس میں محدود سمجھنے لگتا ہے، حالاں کہ حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت دنیا کا ہر ملک، خواہ وہ اشتراکی ہو یا سرمایہ دار، معاشی استحصال کا مخالف ہے اور اس کو ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن ہر ملک کے

نزدیک استحصال صرف وہی ہے جو اس کے تصوّرِ استحصال سے مطابقت رکھتا ہو۔ اشتراکیت ذاتی ملکیت کو استحصال سمجھتی ہے، لیکن اگر ملکیت پر ریاست کا قبضہ ہوجائے تو وہ استحصال نہیں ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ داری کو ذاتی ملکیت میں استحصال کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، البتہ ریاست کا قبضہ اس کے نزدیک استحصال ہے۔ حالاں کہ ان میں سے ہر صورت میں استحصال ہوتا ہے۔ فرد بھی اس کا ارتکاب کرتا ہے اور ریاست بھی کرتی ہے، لیکن نظریے کی محدودیت نے حقیقت کو بھی محدود کردیا۔

بعض اوقات آدمی ایک حق بات کو اختیار کرنا چاہتا ہے، لیکن اپنی نظر کی محدودیت کی وجہ سے وہ اس کے ایک یا چند پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور حق کو ان ہی میں محصور سمجھ لیتا ہے، اس لیے وہ حق کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ اختیار نہیں کر پاتا۔

ان وقتی اور ہنگامی نظریات سے دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان کے لیے یہ تصوّر کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کوئی ایسا نظریہ بھی ہوسکتا ہے جو وقت اور حالات کی پیداوار نہ ہو اور جو حالات کے ہر تغیر کے باوجود زندہ و باقی رہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان نے حق و صداقت کی ہر اساس کو وقتی سمجھ لیا جس کی قدر و قیمت بھی وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے انسان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سوسائٹی کی تعمیر کے لیے کچھ ابدی اقدار بھی ہوسکتے ہیں، جن کی بنیاد پر افراد ایک دوسرے پر اعتماد کرسکیں۔ ہر شخص اپنی جگہ خوف زدہ ہے کہ جس بنیاد پر وہ اپنے جیسے دوسرے فرد سے یا ریاست سے معاملہ کررہا ہے، وہ کب تک قائم رہ سکتی ہے۔

اسلام ایک ابدی حقیقت

اسلام ابدی اور مستقل اقدارِ حیات ہمیں فراہم کرتا ہے۔ یہ اقدار افراد کی زندگی پر ہر دور میں نمایاں رہے ہیں اور آج بھی نمایاں ہیں اور تاریخ کے ایک خاص دور میں اجتماعی زندگی میں بھی اس کا ظہور ہوچکا ہے۔ جو لوگ اسلام کا صرف اس پہلو

سے مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ تاریخ کے ایک خاص دور کا اجتماعی نظام رہا ہے، ان کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ اس دور کے بعد اسلام کی کیا اہمیت ہے؟ حالاں کہ اسلام جس طرح ایک تاریخی حقیقت ہے اس سے کہیں زیادہ وہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کی جڑیں انسان کی نفسیات کے اندر اتری ہوئی ہیں۔ اگر انسان کی نفسیات اٹل ہیں تو اسلام کے لیے بھی فنا نہیں ہے۔ بلاشبہ ایک خاص دور اور ایک خاص ماحول کی اجتماعی زندگی پر اس کی حکم رانی رہی ہے، لیکن وہ اس دور اور اس ماحول کی پیداوار نہیں ہے کہ اس کے بعد ختم ہوجائے۔ وہ نہ تو کسی خاص وقتی مسئلہ کو لے کر اٹھا تھا اور نہ اس کے سامنے کسی خاص قوم کا مفاد تھا۔ وہ ایک ابدی بہار ہے۔ اگر کوئی سوسائٹی اس کا استقبال کرتی ہے تو اس میں بھی بہار آجاتی ہے، لیکن کوتاہ بین نظریں اس کو صرف اس سوسائٹی کی بہار سمجھتی ہیں۔

دو بنیادی سوالات

اسلام اس پہلو سے بحث نہیں کرتا کہ تاریخ کے کس دور اور کس ماحول میں انسان کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان حالات میں اس کے مسائل کیا ہوں گے اور ان کے حل کی تدبیریں کیا ہوں گی؟ زراعتی دور میں انسان کا معاشی مسئلہ کس نوعیت کا ہوگا اور صنعتی دور میں اس کی نوعیت کیا ہوگی؟ بیسویں صدی میں اس کی تہذیب کس مقام پر ہوگی اور اس کے بعد اس میں کیا تبدیلیاں ہوں گی؟ بل کہ وہ انسان سے بہ حیثیت انسان بحث کرتا ہے، خواہ وہ دورِ تاریخ سے پہلے کا انسان ہو یا بعد کا۔ اس کے نزدیک تمدنی و تہذیبی و معاشرتی و سیاسی مسائل انسان کے حقیقی مسائل نہیں ہیں۔ یہ مسائل دو بنیادی سوالات کے تابع ہیں۔ ان سوالات کا جواب ہی اس کے مسائل کی حل کی شکلیں بھی متعین کرے گا۔ اس لیے یہ سوالات ایسے ہیں جنھیں اسے تہذیب و تمدن کے ہر انقلاب کے اندر رہتے ہوئے حل کرنا ہے۔ ان میں سے ایک اطاعت و بندگیِ رب کا سوال ہے اور دوسرا اپنے انجام کا سوال۔

پہلا سوال

پہلے سوال کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے حوالے کردے اور اپنی آزادی سے دست بردار ہوجائے۔ خدائے تعالیٰ کی اطاعت و عدم اطاعت کا سوال ایسا سوال ہے جس کی گونج انسان کے اندرون میں اور اس پوری کائنات میں سنائی دے رہی ہے۔ اس کائنات سے ہم اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ آیا ہمیں اس کائنات کے خالق کے مطیع و فرماں بردار کی حیثیت سے زندگی گزارنی چاہیے یا ہم خود مختار اور آزاد ہیں؟ یہ جس طرح ماضی کا سوال ہے اسی طرح مستقبل اور حال کا بھی سوال ہے۔ اس سوال کی نوعیت محض نظریاتی نہیں ہے، بل کہ یہ جتنا نظریاتی ہے اس سے کہیں زیادہ عملی ہے۔ انسان بہت سے مسائل کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن اس سوال کو حل کیے بغیر وہ زندگی کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتا۔ اس کے سامنے نفس کی خواہشات ہیں، قوم اور وطن کے مطالبات ہیں، رسوم و رواج ہیں۔ ان میں سے ہر چیز اس سے اپنی اطاعت کا تقاضا کرتی ہے۔ اسے لازماً پرستش کے لیے یا تو ان معبودوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا یا خدائے تعالیٰ کی ذات کو۔ اس سوال کو فرسودہ اور بے جان وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اس کائنات کی ایک ایک چیز اور خود اپنی ذات کو جھٹلانے کی جرأت کرسکتا ہو۔

دوسرا سوال

دوسرا سوال جو اسلام انسانوں کے سامنے کھڑا کردیتا ہے وہ آخرت کا سوال ہے۔ وہ اس کو مستقبل کے ایک یقینی واقعہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ آخرت ایک ایسی زندگی ہے جس کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں ہماری موجودہ زندگی کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ تہذیب و تمدن کے کسی بھی مرحلہ کا انسان یہ کہہ نہیں سکتا کہ وہ آخرت سے محفوظ ہے، کیوں کہ یہ ایسا واقعہ ہے جس سے تحفظ کی اس کے پاس کوئی تدبیر نہیں ہے۔

اسے ایک ایسی چیز کا سامنا کرنا ہے جس کے مقابلے کے لیے وہ کوئی ہتھیار نہیں رکھتا۔ وہ ایک ایسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جدھر چند ہی قدم کے بعد اس کی زادِ راہ ختم ہوجائے گی۔ یہ احساس کسی بھی دور اور کسی بھی حیثیت کے انسان کو آخرت کی فکر سے بے نیاز نہیں ہونے دیتا۔ اگر کسی شہر کے افراد کو یہ یقین ہوجائے کہ وہاں بم گرایا جانے والا ہے تو شہر کا ہر فرد، خواہ وہ مزدور ہو، یا مالک، کسان ہو یا صنعت کار، تاجر ہو یا عالم اور محقق، وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ بالکل یہی معاملہ آخرت کا ہے۔ یہ ہر شخص کا اپنا مسئلہ ہے۔ اس سے وہی شخص غافل ہوسکتا ہے جو اس کو انہونی بات سمجھتا ہو، ورنہ اس پر یقین آدمی کو غفلت کی نیند سونے نہیں دے گا۔

خدا اور آخرت کا سوال پوری زندگی کا سوال ہے۔ اس سوال کا ہر جواب یہ چاہتا ہے کہ زندگی کے پورے ڈھانچے کی تعمیر اس کے مطابق کی جائے۔ اس کا تعلق انسان کے ضمیر اور جذبات سے بھی ہے اور سماجی مسائل سے بھی۔ زندگی کے کسی بھی پہلو کو اس سے آزاد نہیں رکھا جاسکتا۔ خدا اور آخرت نہیں ہے تو انسان مجبور ہے کہ اپنے شخصی و اجتماعی تقاضوں کو کسی اور طریقے سے پورا کرے اور اس یقین کے بعد اس کے فکر و عمل کے ہر گوشے پر حکم رانی بھی اسی کی ہوگی۔

خدا اور آخرت پر یقین کا پہلا اثر تو فرد کی اپنی شخصیت پر پڑتا ہے، کیوں کہ یہ براہِ راست ان سوالات کا جواب ہے جو اس کے اندر سے ابلتے ہیں۔ جب انسان کو اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک ایسی ہستی ہے جس کے ہاتھ میں سارا اقتدار ہے، جو اس کی خالق و مالک ہے اور جس کے حضور اس کو ایک دن پیش ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے تو وہ اپنے خالق و مالک کی پکڑ سے خوف زدہ اور اس کے احسانات کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ سراپا احتیاج و طلب اور مجسم خوف و ہراس بن جاتا ہے۔ وہ اس کے لطف و کرم کی امید میں اپنے ہاتھ اس کے رو برو پھیلا دیتا ہے اور سر کو اس کے سامنے جھکا کر بے بسی و فروتنی کا اعتراف کرنے لگتا ہے۔

عبادت کے اصول

انسان کا یہ احساس ایک ابدی اور حقیقی احساس ہے۔ وہ خواہ مصیبت میں ہو یا آرام میں، دورِ تمدن میں ہو یا دورِ جہالت میں، جب بھی وہ خدا کا تصور کرے گا اپنے سینے کو اس جذبے اور احساس سے معمور پائے گا۔ کیوں کہ جذبات اور احساسات کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے اور انسان کے اندرون میں کوئی ایسا انقلاب نہیں آسکتا جس سے اس کی فطرت اب تک ناآشنا رہی ہو۔ اسی لیے اسلام میں عبادت کے اصول و ضوابط اٹل ہیں۔ ان میں کسی بھی قسم کی ترمیم کا نہ تو کسی کو حق ہے اور نہ فی الواقع اس کی ضرورت ہے۔ عبادت، خدا کی خدائی اور عظمت اور اپنے عجز و بے بسی کے اظہار کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ صحیح طریقے کا تعین اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ انسان کو ایسے تمام طریقوں سے بچائے رکھتا ہے جو غلط اور اصل مقصد کے منافی ہیں، ورنہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کے بجائے اس سے بالکل محروم ہی نہ ہوجائے۔

معاملات میں اجتہاد

لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے، اسلام نے اس کے ہر جزئیہ سے بحث نہیں کی ہے، بل کہ ایسے اصول دیے ہیں جو سیاست اور اخلاق کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں کہ انسان کے خارج کی دنیا ہمیشہ انقلابات کی آماج گاہ بنی رہتی ہے۔ وہ اس وقت تمدن کے جس مرحلے میں ہے چند سو سال قبل شاید اس کا تصور بھی اس کے لیے دشوار ہوتا۔ معاملات اور لین دین کے آج کچھ طریقے ہیں تو کل ان طریقوں میں تبدیلی آجاتی ہے۔ ماضی میں انسان جن معاشرتی آداب سے روشناس تھا موجودہ دور میں وہ اس کے لیے غیر مانوس بن چکے ہیں۔ قوانین کی ایسی کوئی فہرست تیار نہیں کی جاسکتی جو ہر دور کے انسانی معاملات پر حاوی ہو۔ اسلام نے سیاست و اخلاق کے جو اصول دیے ہیں، تہذیب و تمدن کا کوئی بھی انقلاب انسان کو ان سے

بے نیاز نہیں کرسکتا۔ وہ ہر دور اور ہر حال میں اس کی رہ نمائی کرتے ہیں۔ یہ اصول سیاست و اخلاق کی راہ کے نشانات ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنے خدا تک پہنچتا ہے۔ یہ نشانات اگر راستے سے ہٹا دیے جائیں تو وہ معاملاتِ دنیا میں خدا کی مرضی نہیں معلوم کرسکتا۔ تمدن، سیاست، تہذیب اور معاشرت کے میدان میں جہاں کہیں انسان کے بھٹکنے اور راہِ راست سے ہٹنے کا خدشہ تھا، اللہ تعالیٰ نے ان اصولوں کے ذریعہ اس کا سدّ باب کردیا ہے۔

یہ نشانات اس بات کا ثبوت ہوتے ہیں کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم ہے۔ اس لیے اسلام کا فیصلہ ہے کہ یہ کبھی مٹائے نہ جائیں اور ان کو ہمیشہ نمایاں اور اجاگر رہنے دیا جائے۔ یہ اصول گنتی میں بہت تھوڑے ہیں اور معاملاتِ زندگی اس قدر وسیع کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان کی مدد سے خدا کی مرضی معلوم کی جاسکتی ہے۔ یہ روشنی کے مینار ہیں جو منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ اور جب تک ان اصولوں سے انحراف اور بغاوت نہیں ہوتی، ان کے درمیان ہونے والی ہر کوشش خدا کو پانے کی کوشش سمجھی جائے گی۔ اس کو اصطلاحِ شریعت میں اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اجتہاد دراصل اس بات کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں اس کی مرضی معلوم کی جائے، اس کا دروازہ قیامت تک کھلا ہوا ہے۔

ﷺ

بغاوت کیوں؟

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام ہی زندگی کے تمام مسائل کا حل ہے، اسی سے انسانوں کی پریشانیاں اور مصیبتیں رفع ہوسکتی ہیں، ان کو امن اور چین، خوش حالی اور اطمینان مل سکتا ہے، اس کو چھوڑ کر وہ کسی اور ذریعہ سے اپنے مسائل کو حل نہیں کرسکتے، تو ہمارے اس دعوے کے ساتھ فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر تو ساری دنیا کو اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ اس سے باغی ہے؟ اس سے نفرت کرتی اور دور بھاگتی ہے؟

اس کے چند اسباب ہیں:

پہلا سبب

اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ انسان کو یہ دنیا اور اس کا مفاد انتہائی عزیز ہے۔ وہ کسی ایسے نظریے کو مشکل ہی سے قبول کرتا ہے جو اس کے مفادات سے ٹکراتا ہو۔ جہاں اس کے ذاتی مفاد اور حق و صداقت میں مقابلہ ہو وہاں وہ اپنے مفاد کو ترجیح دینا پسند کرتا ہے۔ اگر اس سے کہا جائے کہ سچائی کے لیے فلاں نقصان برداشت کرو تو وہ آمادہ نہ ہوگا۔ لیکن وہ اپنے بھائی کے ساتھ مکاری اور دغا بازی کرسکتا ہے، اگر اس کو کسی مادی نفع کی توقع ہو۔ معمولی معمولی فائدے کے لیے اس کو اپنے پڑوسی کے گھر

نقب لگانے، حتیٰ کہ قوم اور وطن سے غداری کرنے میں بھی بسا اوقات تأمل نہیں ہوتا۔

اسلام اس مفاد پرستی کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی تمام الجھنوں اور مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ حقوق اور مفادات کی جنگ ختم کردے۔ دوسروں کا حق چھیننے کے بہ جائے ان کے فائدے کے لیے اپنے حق سے بھی دست بردار ہوجائے، ان کی آسائش و راحت کو اپنے آرام پر ترجیح دے، بل کہ اگر اس پر ظلم و زیادتی ہو تب بھی عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑے، تکبر اور نخوت کا مظاہرہ ہو تو خاک ساری اور فروتنی اختیار کرے، بدخواہی کے جواب میں خیرخواہی اور نفرت کے جواب میں محبت کو دل میں جگہ دے۔ اگر کوئی شخص آپ کے بھائی کو قتل کرتا ہے تو آپ کو اس کی جان لینے کا حق ہے، لیکن آپ کی عظمت اور بلندی اس میں ہے کہ آپ عفو و درگزر سے کام لیں۔ یہ سب کسی مادّی غرض اور دنیوی فائدے کے لیے نہیں، بل کہ اس لیے کہ آپ کا خدا خوش ہو اور آخرت میں اس کی نوازشات کے آپ مستحق ہوں۔

اسلام کا یہ ایسا مطالبہ ہے کہ انسان اس کو اسی وقت پورا کرسکتا ہے جب کہ آخرت اور اس کے نفع وضرر کو دنیا اور اس کے سود و زیاں سے زیادہ یقینی سمجھے۔ لیکن جو چیز مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی ہے اور جس کو انسان اپنی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتا، اس کے متعلق یقین کا اس حد تک پیدا ہونا بہت دشوار ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی ان مفادات کو بھی قربان کردے جن کا وہ شب و روز مشاہدہ کر رہا ہے۔

دوسرا سبب

ہر دور اپنے اندر کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور رکھتا ہے۔ ان ہی خوبیوں کے باعث وہ دور وجود میں آتا ہے اور ان کے ذریعہ دوسرے ادوار سے ممتاز بھی ہوتا ہے، لیکن یہ خوبیاں بیش تر انسانوں کی نگاہوں پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ وہ اس کی نمایاں خرابیوں کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ ایک دور تھا جب کہ انسان بادشاہوں کی فتوحات، ان کے

حسنِ انتظام، ان کی جود وسخا اور ان کے انعامات و اکرامات کے قصیدے پڑھتا تھا۔ لیکن جب یہ دور ختم ہوا اور جمہوریت آئی تو اس کے گن گانے لگا۔ نہ اس کو شاہی نظام کی خرابیاں نظر آتی تھیں اور نہ جمہوریت کی خامیوں ہی کو وہ محسوس کر رہا ہے۔

موجودہ دور میں سائنس نے ترقی کی۔ اس ترقی سے انسان کو بلاشبہ بہت فائدہ پہنچا۔ اس کے ساتھ اس دور کے غلط افکار و نظریات نے اس کو نقصان بھی بہت پہنچایا ہے، لیکن وہ سائنس کی ترقی سے اس قدر مرعوب و متأثر ہے کہ اس دور کی خامیوں اور خرابیوں کے متعلق سوچنے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی مذمت کریں تو محض اس دلیل کی بنا پر آپ کو بے وقوف سمجھا جائے گا کہ دورِ حاضر اس کو ترقی کا ذریعہ خیال کرتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دور کے افکار و نظریات نے مذہب اور اس کے اصول و عقاید کو رد کردیا ہے، اس لیے اس کا مہمل اور لچر ہونا بھی گویا یقینی ہے۔

ہندستان ہی کو دیکھیے۔ یہاں جتنی قومیں بستی ہیں ان میں سے کوئی بھی مذہب کی منکر نہیں ہے، بل کہ سب کی بنیاد ہی مذہبی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندستان کے خمیر میں مذہب شامل ہے، لیکن یہاں کے مفکرین اپنے مسائل کے حل کے لیے یا تو ان ہی نظریات میں سے کسی ایک کو منتخب کریں گے جن کا اس دور میں رواج ہے، یا ان میں قطع و برید کرکے کوئی معجون تیار کریں گے۔ کسی صاحبِ فکر حتیٰ کہ کسی دعوے دار مذہب کو بھی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ مذہب کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل ڈھونڈے، یا کم از کم ان دلائل ہی پر غور کرے جن کی بنا پر مذہب کو غیرعملی اور غیرسائنٹفک خیال کیا جاتا ہے۔

اس دور کا ہر حکم راں نظریہ، خواہ وہ سوشلزم ہو یا جمہوریت یا ڈکٹیٹر شپ، اپنے مزاج اور فلسفے کے لحاظ سے بالکل غیر اسلامی ہے۔ اس کا آغاز ہی خدا سے بے زاری

اور قیامت اور عذاب و ثواب کے انکار سے ہوتا ہے۔ ایسے کسی دور کے متعلق یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ از خود اپنا سینہ اسلام کے لیے کھول دے گا۔

تیسرا سبب

ان نظریات سے وہی لوگ مرعوب نہیں ہیں جو اسلام سے ناواقف ہیں، بل کہ اسلام کے نام لیوا بھی اسی مرعوبیت کا شکار ہیں۔ ان میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو اسلام کے مخالف نظریات کو پورے شرح صدر کے ساتھ قبول کر چکا ہے اور ان نظریات کے ساتھ ہم زبان ہوکر برملا اسلام کو مہمل اور بے معنیٰ قرار دے رہا ہے، جس کو اسی کا افسوس ہے کہ اس کے نام، خاندان اور قوم سے اسلامی تہذیب اور روایات کا اظہار ہوتا ہے، جس طبقے کی اسلام سے بے زاری اس حد تک بڑھی ہوئی ہو وہ گویا یہ اعلان کر رہا ہے کہ اسلام اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے اور انسانیت کے مسائل کا حل اسلام کے اندر نہیں، اس کے باہر ہے۔

دوسرا طبقہ ان افراد کا ہے جس کا ایمان اور یقین تو غیر اسلامی نظریات پر ہے، لیکن اسلام کا نام لینے والی قوم میں پیدا ہونے کی وجہ سے قومی اثرات بھی اس کے اندر موجود ہیں، اس لیے پیروی تو ان ہی نظریات کی پسند کرتا ہے جو سراسر اسلام کے مخالف ہیں اور ساتھ ہی اپنی قوم سے کٹنا بھی نہیں چاہتا۔ اس مقصد کے لیے وہ اسلام کو زندگی کے ان پہلوؤں میں باقی رکھے ہوئے ہے جن سے وقت کے نظریات تعرض نہیں کرتے، لیکن جن پہلوؤں میں ان کا اسلام سے تصادم ہو، وہاں وہ بغیر کسی جھجک کے ان نظریات کو اختیار کر لیتا ہے۔ صحیح معنیٰ میں یہ طبقہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی میں کفر و اسلام، شرک و توحید، انکارِ آخرت و اقرارِ آخرت ساتھ ساتھ باقی رہے۔ اس طبقے کی اس متضاد روش سے اسلام اس قدر مضحکہ خیز معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس کی طرف کوئی شخص آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔

تیسرا طبقہ روایتی مسلمانوں کا ہے، جس نے اسلام پر علمی انداز میں کبھی غور نہیں کیا اور نہ وہ اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ طبقہ چند مبہم عقائد اور قومی روایات کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وہ جانتا تک نہیں کہ اس کے معتقدات پر کس کس طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور جن چیزوں کو وہ مسلّمات اور ناقابلِ تردید حقائق سمجھے ہوئے ہے ان کو کس کس انداز سے چیلنج کیا جارہا ہے؟ اپنے اعتقادات پر اس طبقے کے ثابت قدم رہنے کی ایک اہم وجہ یہی ہے کہ وہ ان اعتراضات سے ناواقف ہے جو اس کے اعتقادات پر ہو رہے ہیں، ورنہ اس کے بہت سے افراد اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔ اس طبقے کے متعلق یہ خیال کرنا ہی فضول ہے کہ وہ وقت کے غلط افکار کے مقابلے میں اسلام کی برتری ثابت کر سکے گا۔ اس کے لیے یہی کافی ہے کہ حق پر جما رہے۔

چوتھا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو وقت کے نظریات کو حکم راں نظریات کی حیثیت سے جانتا ہے۔ ان نظریات کے بغیر وہ ترقی اور سربلندی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ طبقہ تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو ان ہی نظریات وعقائد کی بنیاد پر قومیں ترقی یا تنزل کرتی نظر آتی ہیں جو اس کے دور میں رائج ہیں۔ اس طبقہ نے ہمیشہ عصری رجحانات کے تحت اسلام کی ترجمانی وتفسیر کی ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کے نزدیک اسلام کی حقانیت ثابت ہو ہی نہیں سکتی۔ جمہوریت کا غلبہ ہوا تو اس نے کہا کہ اسلام بھی جمہوریت کا علم بردار ہے اور جب دیکھا کہ جمہوریت کو محدود کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے تو اس نے کہنا شروع کیا کہ اسلام میں بھی اقتدار خلیفہ اور امام ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

یہ طبقہ اپنے حسنِ نیت کے باوجود اسلام کو دوسرے نظریات سے ممتاز اور برتر نہیں ثابت کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقے کی کوششوں نے دنیا کو اسلام کی طرف کبھی متوجہ نہیں کیا۔ کیوں کہ دنیا نے یہ سمجھا کہ زندگی کے متعلق اس کی جو رائے اور نقطۂ نظر ہے، اسلام اس سے الگ کوئی رائے نہیں رکھتا، بل کہ وہ اس کا حامی اور مؤید ہے۔

اس طبقے نے ایک طرف اسلام کا تعارف ایک مستقل نظریۂ حیات کی حیثیت سے ہونے نہیں دیا، دوسری طرف اسلام کو عصری رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی فکر میں بہت سے غیر اسلامی تصورات کو اسلام میں ثابت کرنا شروع کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی اصل تصویر مسخ ہوگئی، کیوں کہ جب بھی کسی نظریے کی آمیزش کسی ایسے نظریے سے کی جائے گی جو اس سے میل نہ کھاتا ہو تو لازماً اس کا حسن و جمال ختم ہوجائے گا اور وہ بھونڈا معلوم ہونے لگے گا۔ مثال کے طور پر اجتماعی ملکیت کا تصور زندگی کے اس نقشے میں تو فٹ ہوتا ہے جو کمیونزم پیش کرتا ہے۔ لیکن انتہائی مضحکہ خیزی ہوگی اگر اسلام سے بھی اس کا ثبوت فراہم کیا جانے لگے۔ کیوں کہ اسلام کا سارا نظام ہی فرد کے حقِ ملکیت اور اس کی آزادی پر قائم ہے۔ اس طرح برتھ کنٹرول یا ضبط ولادت کا تصور ان نظریات کے عین مطابق ہے جو رزق کے معاملے میں اپنے محدود ذرائع و وسائل کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں، لیکن جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ رزق کے خزانے خدا کے ہاتھ میں ہیں، جب وہ اس کی تائید کرتے ہیں تو گویا اپنے عقیدے کی تردید کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ طبقہ رہ جاتا ہے جو اسلام کو آخری سند کے طور پر مانتا ہے اور جس کا عقیدہ ہے کہ اسلام ہی کے ذریعے زندگی کی ساری الجھنیں حل ہوسکتی ہیں، لیکن چوں کہ وقت کے حکم راں نظریات و افکار نے تمدن و سیاست، تہذیب و معاشرت اور علوم وفنون کے میدان سے اسلام کو بے دخل کردیا ہے، اس لیے اس طبقے نے بھی یہ سوچنا چھوڑ دیا کہ زندگی کے ان پہلوؤں کے متعلق اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟ وہ سیاست کے کیا اصول وضع کرتا ہے؟ تہذیب و معاشرت کا کیا نقشہ پیش کرتا ہے؟ مختلف علوم و فنون کے سلسلے میں کیا ہدایات دیتا ہے؟ اس طرح اس طبقے کے نزدیک اسلام عملاً شب و روز کی عمومی زندگی سے خارج ہوگیا اور ایک ایسے دائرے میں محصور ہوکر رہ گیا جس میں کبھی انسانوں کے تعلقات اور ان کے مسائل زیر بحث نہیں آتے۔ آج کا انسان

جن مسائل میں الجھا ہوا ہے، اگر اسلام کو ان کے حل کے طور پر پیش نہ کیا جائے تو اس کے لیے اسلام میں کیا دل چسپی ہوسکتی ہے؟ وہ اسلام کو اپنے دکھ درد کا مداوا کیوں کر تصور کرسکتا ہے؟

اس روش کا سب سے بڑا نقصان خود اس طبقہ کو یہ پہنچا کہ وہ اجتہادی صلاحیت سے محروم ہوگیا، جس کے بغیر وقت کے حالات و مسائل میں اسلام کی رہ نمائی معلوم نہیں کی جاسکتی۔ اس کے اندر یہ اہلیت نہیں رہی کہ اسلام کا تعارف ہر دور کے لیے واحد دینِ حق کی حیثیت سے کرا سکے اور غلط نظریات کے مقابلے میں اسلام کے نظریات کی برتری ثابت کرسکے۔

چوتھا سبب

ان مختلف قسم کی فکری خامیوں کے ساتھ سوائے معدودے چند افراد کے بیش تر مسلمانوں کا طرزِ عمل بھی اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی راہ میں رکاوٹ رہا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اسلام کے بہ جائے غیر اسلام کو انھوں نے اس طرح اپنا لیا ہے کہ ان کی زندگی کے کسی گوشے سے اسلام کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی۔ وہ تاجر ہوئے تو خدا کا انکار کرنے والے تاجروں کی طرح اپنی تجارت میں مکر وفریب، جھوٹ اور رشوت کو اختیار کیا۔ طالبِ علم ہوئے تو ایسے علوم کے فروغ اور تبلیغ میں کوشاں رہے جو اسلام کی نفی کرتے ہیں۔ دولت اور ثروت ملی تو اس کو ان راہوں میں صرف کیا جن میں آخرت فراموش انسان اپنی دولت صرف کرتا ہے۔ صاحبِ اقتدار ہوئے تو جابر و قاہر بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلے۔ پھر کیسے دنیا یہ یقین کرتی کہ ان کے پاس ایسے نظریات ہیں جن میں ساری انسانیت کی نجات ہے، وہ ایسے اصول رکھتے ہیں جو عدل و انصاف کے ضامن ہیں اور وہ ایسی تعلیمات کے حامل ہیں جن میں انسانوں کی فلاح اور کام رانی ہے، ان کے دکھوں کا مداوا اور ان کی پریشانیوں کا علاج ہے؟

مسلمانوں کی اس روش کو دیکھ کر دنیا یہ خیال کرسکتی تھی کہ اب ان کا ایمان اسلام کے اعلیٰ اصول ونظریات پر نہیں رہا اور وہ انھیں چھوڑ چکے ہیں، لیکن دنیا نے ان کے بارے میں یہ خیال نہیں قائم کیا، بل کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ اسلام دین ہی ایسا ہے جو انسان کے اندر جہالت اور بربریت پیدا کرتا ہے، جو اس کو دنیا طلب اور عیاش بناتا ہے، جو مکاری اور جھوٹ کی تعلیم دیتا ہے، کیوں کہ مسلمانوں نے اپنی ساری بداعمالیوں کے باوجود ایک ایسی امت کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا جو اسلام کو مانتی ہے اور اسلام سے وابستگی ہی میں اپنی نجات سمجھتی ہے۔

مسلمانوں کے فکری جمود وتعطل کی بنا پر اسلام کو ایک مخصوص فرقے کے چند ایسے عقائد کا مجموعہ سمجھ لیا گیا جن کا زندگی اور اس کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ان کی غلط روی نے یہ تصور دیا کہ اسلام بہیمیت اور نفرت وعداوت کا دین ہے۔ ان دونوں تصورات کو مختلف اسباب، کے تحت خوب پھیلایا اور فروغ دیا گیا۔ اب وہ اس طرح ذہنوں میں رچ بس گئے ہیں کہ جب تک ان کو کھرچ کر نہ نکال دیا جائے اسلام کا صحیح تصور ان کی جگہ نہیں لے سکتا۔

پانچواں سبب

اسلام کے بارے میں ان دونوں قسم کے تصورات کو پیدا کرنے میں مسلمانوں کی فکری وعملی خامیوں کے ساتھ دوسرے مذاہب کی تعلیمات اور ان کے طرزِ عمل کا بھی بہت دخل ہے۔

اسلام ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر دور اور ہر علاقے میں مختلف ناموں کے ساتھ پیش کی جاتی رہی ہے، اس لیے دنیا کا کوئی علاقہ اور کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جہاں اسلام کسی نہ کسی شکل میں نہ پہنچا ہو، لیکن بیش تر انسانی آبادیوں میں ایک عرصۂ دراز سے اس کا اعادہ نہیں ہوا، اس لیے وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہ سکا۔ حتیٰ کہ بعض

مقامات پر انسانی فلسفوں اور خیالات نے اس کو اس قدر مسخ کردیا ہے کہ اس کا پہچاننا تک دشوار ہوگیا ہے۔ دنیا میں ہر فکر کے وہی شارحین معتبر سمجھے جاتے ہیں جن کا ذہن و دماغ اس فکر کو قبول کرچکا ہو، کیوں کہ ایسے ہی افراد کے لیے یہ ممکن ہے کہ دیانت داری کے ساتھ اس کی تشریح کریں اور اصل فکر کو کہیں مجروح نہ ہونے دیں۔ لیکن خدا کا دین، جو مختلف انسانی طبقات کے پاس پہنچا، اس کے ساتھ یہ ظلم ہوا کہ اس میں ہر شخص نے اپنی فکر داخل کرنے کی سعی کی، خواہ اس دین کے لیے وہ مخلص ہو یا غیر مخلص۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اصل دین سے متضاد خیالات بھی اس کے ایک جزء کی حیثیت سے اس میں گھس آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں خدائی تعلیمات کا حصہ اتنا کم رہ گیا ہے کہ اس کو خدا کی طرف سے نازل کردہ دین کہنا بھی زیادتی ہے۔

کسی بھی نظام کو بگاڑنے اور مسخ کرنے کے بعد ہم یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے مطلوبہ نتائج پیدا کرسکے گا۔ چناں چہ یہی ہوا کہ جب اسلام کی ناقص، بل کہ محرّف تعلیمات کو زندگی کے میدان میں لایا گیا تو پہلے ہی قدم پر محسوس ہوا کہ وہ زندگی کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیا جاتا اور زمانے کے انقلابات اور حالات کی تبدیلیوں سے حقیقی دین میں جو خامیاں گھس آئی ہیں ان کی اصلاح کی جاتی، لیکن افسوس کہ ہر گروہ اپنے اپنے غلط اور بگڑے ہوئے تصوّرات پر جما رہا اور ان تصوّرات کے خلاف جس چیز کو بھی دیکھا اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگیا، گویا دنیا کی ہر حقیقت کو اس کے مزعومات کا ساتھ دینا چاہیے، ورنہ اس کا وجود ہی نہیں تسلیم کیا جائے گا، اگرچہ ہزارہا آنکھیں اسے دیکھ رہی ہوں اور صدہا طریقوں سے اس کو محسوس کیا جارہا ہو۔

مختلف مذاہب کا رویہ چوں کہ خدا کے نام پر ہوتا رہا، اس لیے دنیا ہر اس تعلیم

سے بدظن ہوگئی جو خدا کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور یہ سمجھنے لگی کہ مذہب چند دوراز کار اوربعید از عقل تصوّرات کا نام ہے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے زندگی کے مسائل کے حل کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا بھی حماقت سمجھ لیا گیا۔ حالاں کہ اس رویے نے صرف ان مزعومات اور خرافات کی تردید کی ہے جن کو خدائی تعلیم کا نام دے دیا گیا ہے، ورنہ جہاں تک خدا کی طرف سے نازل کیے ہوئے آخری دین کا تعلق ہے، وہ جوں کا توں ایک لفظ کی کمی بیشی کے بغیر باقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا نام لینے والوں نے بہت سی غلطیاں کیں اور اس راستے سے ہٹے رہے جس کی طرف وہ انھیں بلاتا ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس دین کو اسی شکل میں محفوظ رکھا جس شکل میں وہ انھیں ملا تھا۔ آج یہ دین ہمارے سامنے ہے اور اپنے حق ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ اب تک کوئی تحقیق اور تجربہ اس اعلان کو غلط نہیں ثابت کرسکا۔

***